سپنوں کی شہنائی

دیبا خانم

چند باتیں

میں نے اس ناول میں پہلی بار پنجاب کے اس ماحول کو پیش کیا ہے، جہاں جلتے سورج کے نیچے کسان اپنے کھیتوں میں پسینہ بوتے ہیں اور آنسوؤں کی فصل کاٹتے ہیں اور ان کی جوان بیٹیاں خوابوں میں شہنائی کی آوازیں سنتی ہوئی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

چناب کی لہریں جب بھی بپھرتی ہیں اس دیس کی سوہنی کو ہمیشہ کچے گھڑے اور کچے سہارے ہی ملتے ہیں۔ اس کہانی کی ریشماں بھی جھوٹے سہاگ کا کچا سہارا لیکر ساجد کو حاصل کرتی ہے۔ کچے رشتے کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔ ساجد کی محبوبہ شادو جانتی ہے کہ کچا گھڑا کبھی پیار کی منزل تک نہیں پہنچاتا۔ دراصل یہ شادو جیسی دلیر لڑکیوں کی داستان ہے جو اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لئے سیلابی لہروں سے لڑتی رہتی ہیں اور کسی نادان سوہنی کی طرح ڈوب جانا گوارا نہیں کرتی ہیں۔

دیبا خانم

اُس
کی سمجھ میں نہیں آرہا
تھا کہ وہ کیوں بھاگ رہی
ہے وہ جس کے سپنے دیکھتی تھی
اور سپنوں میں جس کے پیچھے
بھاگتی تھی آج اسے سامنے دیکھ
کر ہرنی کی طرح بدک
گئی تھی،

شہنائی کی آواز ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک گونج رہی تھی۔

ٹانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ساجد نے چاروں طرف دُور دُور تک دیکھا۔ کھلی فضا میں اس بات کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ شہنائی کی آواز کس سمت سے آرہی ہے۔ اوپر مٹیالے آسمان پر کالے کالے بادل اس طرح اُمنڈ رہے تھے۔ جیسے شہنائی کی جذباتی تان پر مستی بھری انگڑائیاں لے رہے ہوں۔

ایسے ہی نشیلے موسم میں سہاگ کے سپنے جوان ہوتے ہیں اور شہنائی کی آواز جسم میں انگڑائیاں سی بھر دیتی ہے۔ ساجد نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنے جسم کو ذرا سا بل دیا۔ تو بدن کا جوڑ جوڑ چٹخنے لگا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"بڑا سہانا موسم ہے۔ پتہ نہیں کس خوش نصیب کی شادی ہو رہی ہے؟"

"شادی کیا ہو رہی ہے۔ یوں سمجھو نگام دی جا رہی ہے۔"

"بڑی خوب صورت نگام ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"مگر بے وقت ہے۔" کوچوان نے کہا۔ "دریا کا پانی بڑھتا جا رہا ہے۔ اس پار میراں کی بستی ڈوب رہی ہے اور اس پار شادیانے بج رہے ہیں۔ ساجد تیرے پنڈ کے پٹواری اور زمیندار اپنی آن پر مرجاتے ہیں۔ مگر پنڈ والوں کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے ...."

"اچھا تو یہ شادی میرے ہی پنڈ میں ہو رہی ہے۔" ساجد نے کہا۔

"ہاں ۔ ۔۔۔ ذرا جا کر دیکھ ۔۔۔ قیامت کا منظر ہے ۔۔۔ بوڑھے اور نوجوان سب مل کر دریا کے بند کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ راتوں کو جاگ کر بند کی نگرانی کرتے ہیں۔ دن کو فصل کاٹتے ہیں۔ کیا پتہ کہ کب کھیتوں میں پانی آجائے اور فصل تباہ ہو جائے۔ بہت سے لوگ تو پنڈ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"تعجب ہے۔" ساجد نے کہا۔ "ایسے وقت شادی کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔"

"یہ شادی نہیں، اپنی دولت اور طاقت کی نمائش ہے۔ جناب علی نے اپنے گھر کے چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ تاکہ دور دور کے پنڈ والے بھی جان لیں کہ اس کی بیٹی ریشماں دلہن بن رہی ہے۔"

"ریشماں ۔۔۔!"

ساجد کی زبان پر بے اختیار "ریشماں" کا نام آگیا۔ چھ برس پہلے جب وہ یہاں سے نیوی فورس کا رنگروٹ بن کر گیا تو اس وقت ریشماں چودہ برس کی ایک گوری چٹی سی لڑکی تھی۔ اب تو وہ بیس برس کی ہو گئی ہو گی۔ اس عمر میں تو لڑکیاں چڑھتی ندی کی طرح میکے کا بند توڑ کر سسرال کا راستہ تلاش کرتی ہیں۔

کوچوان نے کہا۔

"ریشماں کی جوانی سات پنڈ اِدھر اور سات پنڈ اُدھر تک مشہور رہی ہے۔ جناب علی لاؤڈ اسپیکر نہ لگاتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ مگر وہ تو زمیندار افضل چوہدری کو یہ آواز سنا رہا ہے۔ ریشماں کی شادی پہلے اس کے بیٹے سے ہونے والی تھی۔"

"اچھا ۔۔۔!" ساجد نے پوچھا "پھر اس کے بیٹے سے کیوں نہ ہوئی۔؟"

"کیوں نہ ہوئی۔ یہ نہ پوچھو۔ یہ دیکھو کہ کسی سے اس کی شادی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں ——— کیونکہ ایک لڑکی ہے اور دیوانے ہزار ہیں ——— کرنالے کا تھانیدار بھی اس پر مرتا ہے۔"

ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کانٹوں کی سیج پر دلہن بنی بیٹھی ہے۔"

"ہاں ——— یہی بات ہے۔ جناب علی کے ہاں جتنے مرد ہیں۔ وہ سب مسلح اور چوکنے رہتے ہیں ——— تھانیدار اور افضل چوہدری کی طرف سے خطرہ ہے۔ وہ کئی بار دھمکی دے چکے ہیں کہ ریشماں کی ڈولی پنڈ سے باہر نہ جانے دیں گے۔"

اس نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل غلطی جناب علی کی ہے۔ پہلے اس نے افضل چوہدری کے بیٹے حمیدے کو رشتہ دینا چاہا تھا پھر کرنالہ کے پٹواری نے اسے لالچ دیا کہ دریا کے کنارے جو اس کی زمین مقدمہ بازی میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اسے دیدے گا ۔ اور مقدمہ واپس لے لے گا ——— بس جی، ایک زمین کے لئے اپنی بیٹی کو بوڑھے پٹواری سے بیاہ رہا ہے۔"

ساجد نے کہا۔

"اس کی بیٹی ہے کہیں بھی بیاہ دے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔"

"پھر بھی افسوس ہوتا ہے۔" کوچوان نے کہا۔ "لڑکی کیا ہے۔ ہیرا ہے ہیرا ——— وہ بوڑھا پٹواری اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے۔ نہ جانے تو کتنے برس کے بعد آ رہا ہے ——— ساجے ——— اگر یہاں ہوتا اور ریشماں کو ایک نظر دیکھ لیتا تو اس کی بے قدری پر ضرور افسوس کرتا۔"

"چلو اچھا ہے کہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ورنہ اس کے لئے آہیں بھرنے والوں میں میرا نام بھی شامل ہو جاتا۔"

کوچوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم فوجی لوگ آہیں بھرنا کیا جانو ؟ ——— تمہیں تو اپنی بندوق سے محبت ہوتی ہے ——— اتنے برس ہو گئے اور آج اپنے گھر کو لوٹ کر آئے ہو۔"

"یہاں ایک ماں کے سوا اور کون ہے کہ لوٹ کر آتا۔ اُسی کو اپنے پاس بلا لیا کرتا تھا۔ اس بار ماں ضد کرتی رہی کہ پنڈ آ جاؤ۔ وہ میری شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"اچھا ——— !"

"ہاں ——— ! میں نے بھی سوچا کہ ماں اکیلی رہتی ہے۔ بہو آ جائے گی۔ تو بڑھاپا آرام سے گزر جائے گا۔"

"اور کیا تیری جوانی آرام سے نہیں گزرے گی ؟"

ساجد ہنسنے لگا۔

"اپنی جوانی تو سمندر کی لہروں سے لڑتے گزرتی ہے۔"

"جہاز کی نوکری میں کچھ ترقی بھی کی ہے یا نہیں؟"

"نیوی میں کیپٹن ہوں کیپٹن ——— ماں کہتی تھی کہ بڑا افسر بن کر آنا ——— اب اس سے بڑا افسر کیا بنوں گا۔ وہ تو پاؤں میں شادی کی زنجیر ڈال رہی ہے اب تو آدھی ترقی گھر والی کے آنچل میں بندھ جائے گی۔"

کوچوان ہنسنے لگا۔

"تیری ماں بڑی سمجھدار ہے اسی لئے تیری شادی کر رہی ہے کہ بیوی کے لئے مزدر گھر لوٹ کر آیا کرے گا۔"

"لوٹ کر کیا آنا ہے۔ میں تو دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گا۔ وہاں نوکری بھی ہو گی اور گھر گرہستی بھی . . . . "

"بڑی اچھی بات ہے ——— اچھا یہ تو بتا لڑکی کیسی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کہ اب کیسی ہے۔ جب یہاں سے گیا تو چھوٹی سی تھی۔ یعنی یہی کوئی بارہ تیرہ برس کی تھی۔ اب تو ماں اس کی تعریف میں خط کے خط سیاہ کر دیتی ہے۔"

کوچوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ماں جو ہے ——— بہو کی تعریف نہیں کرے گی تو اور کس کی تعریف

کرے گی۔"

ساجد نے کہا۔

"ماں کا خط پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ ایسی خوب صورت لڑکی پھر اس دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہو گی۔"

"نہیں ساجے ——— ایسا نہ بول ——— یہ مانا کہ دنیا میں ایک سے ایک حسین لڑکی ہے ——— تیری ماں نے جسے پسند کیا ہے۔ وہ بھی لاکھوں میں ایک ہو گی ——— مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ریشماں کا جواب نہیں ہے۔"

ساجد کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

ریشماں ——— ریشماں ——— ریشماں ——— اگر وہ سب سے زیادہ حسین ہے تو ماں نے اسے پسند کیوں نہیں کیا؟ دنیا کی ہر ماں اپنے خوبصورت سے خوبصورت بہو لانے کی فکر میں رہتی ہے۔ پھر ماں کو ریشماں خوبصورت کیوں نہ لگی؟

کوچوان نے ٹانگے کو ایک کچے راستے پر موڑتے ہوئے کہا۔

"ریشماں تو ایسی ہے کہ اسے بہو بنانے کا ارمان ہر ماں کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بہت سی عورتیں اسے فساد کی جڑ سمجھتی ہیں جو لوگ اسے حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے فساد کھڑے کرتے رہتے

ہیں ——— چلو اچھا ہی ہے کہ تیری ماں اس جھگڑے سے دُور رہی
رہی ——— ہاں ——— تُو نے یہ نہیں بتایا کہ ماں نے کیسے پسند
کیا ہے ؟"

ساجد نے بیزاری سے کہا۔

"چھوڑو ——— جسے بھی پسند کیا ہو ——— میں تو صرف ماں کی خوشی
دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، ماں کو خوش دیکھنا ہی بہتر ہے، کسی خوبصورت لڑکی کیلئے کیوں
خواہ مخواہ جان کی بازی لگائی جائے۔ ۔ ۔ ۔"

ساجد کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ طعنہ دے رہا ہے کہ ریشماں کے لئے
وہ جان کی بازی نہیں لگا سکتا ——— اس نے اچانک کوچوان کی گردن پیچھے سے
دبوچ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کھوتے دا پُتر ——— مجھے للکارتا ہے۔"

ٹانگہ ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ کوچوان کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ساجد
کی ہتھیلی نہیں ——— کوئی آہنی شکنجہ ہے ——— وہ پھڑپھڑا کر
کہنے لگا۔

"ارے ارے ساجے ——— کیا کرتا ہے چھوڑ مجھے ۔ ۔ ۔ ۔"

ساجد نے اسے ایک طرف دھکیل کر حقارت سے کہا۔

"میں چاہوں تو بھری برادری سے ابھی ریشماں کو اٹھا کر لے آؤں۔ میں فوجی
ہوں۔ دشمن کی صفوں میں گھس کر کامیابی کے جھنڈے گاڑنا جانتا ہوں ——
لیکن فرض اور ایمان ہمارا پہلا اصول ہے ——— ملک کی خدمت ہو یا ماں
کا حکم، اسے پورا کرنا میرا فرض ہے ——— خبردار! آئندہ مجھے للکارنے کی
کوشش نہ کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کوچوان نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا۔

"میری توبہ ——— میرے باپ کی توبہ ——— تُو آدمی ہے یا
لوہے کا شکنجہ ——— ارے میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تُو لڑنے بھڑنے والا آدمی
نہیں ہے ——— بہادر سپاہیوں کی یہی شان ہوتی ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں
کے لئے نہیں، اپنے ملک کے لئے جان دیتے ہیں۔"

ساجد نے کہا۔

"چکنی چپڑی باتیں نہ کر۔ ٹانگہ آگے بڑھا۔"

وہ لگام کو جھٹکے دیکر گھوڑے کو ہانکنے لگا۔

دونوں خاموشی سے بیٹھے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ تھوڑی دیر
بعد ساجد کو یہ خاموشی کھلنے لگی۔ اس نے کوچوان کے شانے کو پیار سے تھپتھپا
کر کہا۔

"میں نے تجھے پر زیادتی کی ہے ——— تُو بُرا مان گیا ؟"

وہ دانت نکال کر بولا۔

"نہیں ——— تو میرے بچپن کا یار ہے۔ یار کی بات کا کیا بُرا ماننا؟"

"تو پھر باتیں کر!"

"کیا باتیں کروں ——— اِس پنڈ میں تو ہر ایک کی زبان پر دو ہی باتیں ہیں ——— ایک بڑھتا ہوا سیلاب اور دوسری ریشماں ——— اب اگر اس کی بات کروں تو تُو پھر میری گردن پکڑ لے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں ——— اب تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گا ——— ویسے یہ بتا کہ شادو کیسی لڑکی ہے؟"

"شادو ———؟" کوچوان سوچنے لگا۔

"ہاں ——— وہ جو رنو چاچا کی لڑکی ہے ——— وہی!"

"اچھا وہ ——— وہ تو بہت اچھی ہے، بہت خوب صورت ہے، کیا اسی کے ساتھ تیری شادی ہوگی؟"

"ہاں ———!"

"ارے تو تُو نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ وہ تو لاکھوں میں ایک ہے۔"

"پھر وہی خوشامد والی باتیں ———؟" ساجد نے تنبیہ کے انداز میں

کہا۔

"خوشامد نہیں ——— سچ کہتا ہوں، تیری ماں نے بہت اچھی بہو پسند کی ہے تُو دیکھے گا تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔"

"کیا خوبی ہے اس میں۔؟"

"بہت سی خوبیاں ہیں ——— خوب صورت ہے ——— ہنس مُکھ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنتی ہے۔ اس وقت بھی اپنے باپ کے ساتھ کھیت میں کام کر رہی ہوگی۔"

"کھیت میں ———؟" ساجد چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔

گندم کے خوشے ہوا کی زد پر لہرا رہے تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی ——— کسان مرد اور عورتیں پکی ہوئی فصل کو کاٹ رہے تھے۔

ساجد نے پوچھا۔

"اب ہمارے پنڈ کی عورتیں بھی کھیتوں میں کام کرنے لگی ہیں؟"

"وقت ہی ایسا آگیا ہے" ——— کوچوان نے جواب دیا۔ "اگر پکی ہوئی فصل کو جلد سے جلد محفوظ نہ کیا گیا تو سیلاب کسی وقت بھی بہا کر لے جائے گا۔ اسی لئے مرد، عورت، بچے سب ہی دن رات کام کرتے ہیں۔"

ساجد یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ شادو بھی ضرور اپنے باپ کے ساتھ

کام کر رہی ہوگی ۔"

"ٹانگہ روک دے ۔" ساجد نے کہا۔

اس نے ٹانگہ روکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے ۔ ؟"

اس نے ٹانگہ سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"دینو چاچا، افضل چوہدری کے کھیت میں کام کرتا ہے نا ؟"

"ہاں ۔ !"

"بس تو پھر تُو جا ــــ سامان گھر پہنچا دینا ــــ ماں سے کہنا میں دینو چاچا سے مل کر آرہا ہوں ۔"

کوچوان نے سر کھجاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"دینو چاچا سے یا . . . ؟"

ساجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دونوں سے ــــ مگر ماں سے نہ کہنا !"

وہ کان پکڑ کر بولا۔

"میری توبہ ــــ میرے باپ کی توبہ . . . !"

یہ کہہ کر اس نے ٹانگہ آگے بڑھا دیا۔

ساجد کچے راستے سے اتر کر کھیتوں کی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

دوپہر کا وقت تھا مگر دھوپ نہیں تھی۔ بدلی چھائی ہوئی تھی۔ بارش کے آثار نظر آرہے تھے۔ ہوا میں ایسی نمی اور ایسی ٹھنڈک تھی کہ ایک عجیب گدگدی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ گنگناتے ہوئے ایک پگڈنڈی سے دوسری پگڈنڈی کی طرف چلتا گیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں اور مرد اپنا کام روک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ دور چلا جاتا تو وہ پھر کام کرتے ہوئے اس پر تبصرہ کرنے لگتے۔

"معلوم ہوتا ہے کوئی لاٹ صاحب ہے ۔"

"نہیں ــــ یہ شاید ساجے ہے ۔"

"ارے ساجے تو فوج میں ہے اور یہ بندہ سفید وردی پہن کر گھوم رہا ہے ۔"

"تو نہیں جانتا چاچا ــــ جہاز میں کام کرنے والے فوجی کی وردی ایسی ہی ہوتی ہے۔"

دور ایک کھیت سے گزرتے وقت ایک بوڑھے نے اسے ٹوک دیا۔

"ارے تُو ساجے تو نہیں ہے ؟"

"جی ہاں ــــ سلام وعلیکم !"

"وعلیکم السلام ــــ جیتے رہو بیٹا ! کب آئے ؟"

"بس ابھی آرہا ہوں۔ دینو چاچا کہاں ہیں ؟"

وہ آج نہیں آیا۔ بے چارہ بیمار ہے۔ وہ دیکھو ـــــ وہاں اس کی بیٹی کام کر رہی ہے۔"

ساجد نے دور ایک کھیت کی طرف دیکھا۔ ایک لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں درانتی لئے کام کر رہی تھی۔ بوڑھے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں اسے بلاتا ہوں"

ساجد نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں، آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود چلا جاتا ہوں۔"

وہ شادو کی طرف جانے لگا۔

ایک بوڑھی عورت نے بوڑھے کے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

"یہ شادو کا منگیتر ہے۔"

"ہاں ـــــ میں جانتا ہوں۔ شادو بڑے نصیب والی ہے۔ اللہ ہماری بیٹی کے نصیب بھی جگائے۔"

وہ بڑی حسرت سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بیٹی ایک طرف کٹی ہوئی فصل کا ڈھیر لگا رہی تھی۔

"نازو کی ماں" ـــــ بوڑھے نے کہا ـــــ "اب کے ہم گندم نہیں بیچیں گے۔ مہمانوں اور براتیوں کے لئے کچھ نہ کچھ بچا کر رکھنا ہی ہوگا۔ کون

جانے کب، کہاں سے لڑکی کا رشتہ آ جائے۔۔۔۔"

نازو کام کرتے کرتے ایک ذرا رُک گئی اور ایک سرد آہ بھر کر دور شادو کی طرف دیکھنے لگی۔

ساجد آہستہ آہستہ چلتا ہوا شادو کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ ساجد اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے گورے اور اُجلے ہاتھ میں درانتی تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔ اس حرکت کے ساتھ سر کی چوٹی اس کی پشت پر ناگن کی طرح ادھر سے اُدھر تھرک رہی تھی۔

"شادو ـــــ!" اس نے ہولے سے آواز دی۔

وہ چونک کر پلٹی۔ پھر ایک اجنبی کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

کوچوان نے اسے ٹھیک ہی کہا تھا کہ دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے وہ کھیت میں کام کر رہی تھی۔ اس لئے سنگار سے بے نیاز تھی۔ پھر بھی اس کا اُجلا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، سانسوں سے پھڑکتی ہوئی ستواں ناک اور رس بھرے گلابی ہونٹ کچھ ایسے دلکش اور جاذب نظر تھے کہ ساجد کی نظریں تھم کر رہ گئی تھیں۔

شادو نے پہلے تو اس کی سفید وردی کو دیکھا پھر تعجب سے پوچھا۔

"کون ہو تم ـــــ؟ میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"تم نے میرے خوابوں میں آکر کہا تھا کہ تمہارا نام شادو ہے۔"

شادو کے چہرے پر سختی آگئی۔ وہ درانتی دکھاتی ہوئی غصہ سے بولی۔

"خواب میں یہ درانتی دیکھی تھی؟"

ایک سپاہی کو اپنی محبوبہ کا یہ انداز بہت ہی پیارا لگا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، دیکھی تھی۔ پھر میں نے تمہارے ہاتھ سے درانتی لے کر کہا تھا۔ کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"ارے۔ کہیں تُو پاگل تو نہیں ہے۔؟"

"پاگل تو نہیں تھا تمہیں دیکھ کر ہو گیا ہوں۔"

"ہُم ——— !" وہ گردن ہلا کر بولی۔ "تمہارا دماغ ٹھیک کرنا ہی ہوگا"

اسی وقت نازو کے باپ نے دور سے چیخ کر کہا۔

"اری شادو ——— کام چھوڑ دے۔ ہم پورا کر لیں گے تُو اسے گھر لے جا!"

شادو حیرت سے نازو اور اس کے ماں باپ کو دیکھنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"چاچا ——— یہ پاگل ہے کون؟ ——— میں اسے اپنے گھر کیوں لے جاؤں؟"

نازو اور اس کے ماں باپ زور زور سے ہنسنے لگے۔ ساجد نے آہستہ سے کہا:

"میری طرح یہ لوگ بھی پاگل ہو گئے ہیں۔ خواہ مخواہ ہنس رہے ہیں۔"

نازو کی ماں ہنستی ہوئی بولی۔

"نی شادو ——— چپ چاپ اسے گھر لے جا ——— اگر ہم نے بتا دیا کہ یہ کون ہے تو تُو شرمندہ ہو جائے گی۔"

"یہ لو ——— میں کیوں شرماؤں گی۔ پاگل کو دیکھ کر شرم نہیں آتی۔ افسوس ہوتا ہے۔"

"بُری بات ہے بیٹا! ایسے خوشی کے موقعہ پہ افسوس نہیں کرتے۔ یہ تیرے نصیب سنوارنے آیا ہے ——— ساجے ہے ساجے ——— مائی خیراں کا بیٹا۔۔۔"

شادو کے ہاتھ سے یک بیک درانتی چھوٹ گئی۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی تھی۔ گھبراہٹ اور شرم کی ملی جلی کیفیت سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ اچانک وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔

"ارے سنو تو ——— شادو!" ساجد بھی اس کے پیچھے بھاگا۔

نازو اور اس کے ماں باپ کے قہقہے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔

شادو ایک کھیت سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کھیت

کی طرف بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں بھاگ رہی ہے ـــــ شرم و حیا کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس طرح حواس باختہ ہو کر بھاگنا عجیب بات تھی۔ وہ جس کے سپنے دیکھتی تھی اور سپنوں میں جس کے پیچھے بھاگتی تھی۔ آج اسے سامنے دیکھ کر ہرنی کی طرح بدک رہی تھی۔

پھر وہ لہلہاتی ہوئی فصل کے درمیان پھسل کر کیچڑ میں گر پڑی۔ منہ سے ایک کراہ نکلی اور کمر بل کھا کر رہ گئی۔ اس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے گندم کے خوشے جھوم رہے تھے۔ بگاہوں کے اطراف ساری دنیا چھپ گئی تھی صرف سر پہ کالی بدلیوں سے گھرا ہوا آسمان نظر آ رہا تھا۔

وہ ہانپتی ہوئی اپنی سانسوں کو درست کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں اور کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے تھے ـــــ "اللہ! میں اس حالت میں اُن کا سامنا کیسے کروں؛ وہ میری تلاش میں بھٹک جائیں تو اچھا ہے۔۔۔"

پھر کیچڑ اور پانی میں قدموں کی آواز سنائی دی ـــــ چھپ چھپ ـــــ چھپ چھپ ـــــ گندم کی ہریالی سرسرانے لگی، جیسے کوئی آگے بڑھنے کے لئے سامنے سے جھاڑیاں ہٹا رہا ہو۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

قدموں کی آواز قریب آ کر رُک گئی۔

"شادو ـــــ!" کانوں کے پاس سرگوشی سنائی دی۔

وہ چپ رہی۔ دل کی دھڑکنیں بُری طرح بول رہی تھیں۔

پھر اس کی کلائی ایک بھرپور مردانہ گرفت میں آ گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ ساجد نے کہا۔

"مجھ سے بات کرو۔"

وہ خاموش رہی۔

"نہیں بولو گی۔؟"

وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

"ہم ـــــ لڑکیوں کو جو چیز پسند نہیں ہوتی۔ وہ اس سے دور بھاگتی ہیں، میں سمجھ گیا۔ تم مجھے پسند نہیں کرتی ہو۔"

وہ پریشان ہو گئی۔

"اچھی بات ہے میں واپس جاتا ہوں۔"

شادو کا دل دھک سے رہ گیا۔ یکبارگی وہ تڑپی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر جائے۔ اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

اسی وقت بارش کی بوندیں پڑنے لگیں۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ دونوں بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور بڑی محبت سے کہا۔

"میری ماں نے اپنے لئے بہت اچھی بہو پسند کی ہے۔ ابھی تک بچوں کی طرح کیچڑ میں کھیلتی ہے۔"

وہ شرمانے اور مسکرانے لگی، ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں اس کے رخساروں پر، اس کی ناک پر اور اس کے گلابی ہونٹوں پر شبنم کی طرح ٹپک رہی تھیں۔

پھر بارش اچانک تیز ہوگئی۔

ساجد نے اسے دونوں بازوؤں کی پناہ میں لے کر کہا۔

"آؤ — میں تمہیں چھپالوں...."

بادل آسمان کو چھپانے لگے۔ بجلی مچل مچل کر مسکرانے لگی۔ دور دور تک گندم کے خوشے ہوا کے دوش پر لہرا کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

اس کے جی میں آیا کہ ابھی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر گلی میں ساجد کے قدموں پر جاگرے اور تڑپ تڑپ کر جان دیدے تاکہ اسے لڑکیوں کے دلوں میں جھانکنے کا تجربہ ہو جائے۔

عورتیں ڈھولک بجا کر سہاگ کے گیت گا رہی تھیں اور دو لڑکیاں ریشماں کے ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھیں۔

پرسوں اس کے دروازے پر بوڑھے پٹواری کی بوڑھی بارات آنے والی تھی۔

کہاں وہ بڑھاپا اور کہاں یہ جوانی ——— آگ اور پانی کو ایک بندھن میں باندھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ بوڑھا پانی اس لپکتے ہوئے شعلے کو کیا بجھاتا؟ ریشماں خود ہی اپنی آنکھوں کے پانی سے اپنی آگ کو بجھا رہی تھی۔

عورتیں خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ لیکن افسوس اور ہمدردی سے

اسے دیکھتی جا رہی تھیں۔ وہاں کی بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا کہ ایسا حسن و جمال پچھلے پچاس برسوں میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ——— ایسی بات نہیں تھی کہ وہاں خوب صورت لڑکیاں پیدا ہی نہیں ہوتی تھیں۔ پنجاب تو ہیر اور سوہنی کی خوب صورتی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ریشماں کا سوگوار حسن پھر کسی وارث شاہ کو پکار رہا تھا۔ آؤ ——— ! اور میری بھی ایک لازوال داستان لکھو۔ میرے اطراف کتنے ہی رانجھے ہیں جو سنیاس یا جوگ لینے کی بجائے میرے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اتنے جوانوں کے نرغے سے ایک بوڑھا مجھے اٹھا کر لے جا رہا ہے۔

وہ پھر رونے لگی۔

وہ رونے والی آنکھیں اتنی خوب صورت تھیں کہ آنسو بھی موتی کے دانے نظر آتے تھے۔ افضل چوہدری کے لڑکے حمیدے نے ایک بار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا تھا کہ میرا بس چلے تو تیری آنکھیں چومتے ہوئے ساری زندگی گزار دوں۔

حمیدے ایک مغرور اور دولت مند باپ کا بیٹا تھا اور باپ کی طرح اتنا مغرور اور ضدی تھا کہ جو چیز سیدھی طرح حاصل نہ ہوتی۔ اسے جبراً اٹھا کر لے جاتا تھا ——— ریشماں بھی اگر دولت مند اور چالاک باپ کی بیٹی نہ ہوتی تو حمیدے بہت پہلے ہی اسے چھین کر لے جاتا۔ اس کا باپ جناب علی

اپنی چالاکی اور مکاری کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھا۔ آج بھی حمیدے اور کرنالے کا تھانیدار اپنی طاقت اور اپنا رسوخ استعمال کر رہے تھے کہ کسی طرح جناب علی کو مات دے کر ریشماں کی ڈولی کو اپنے دروازے کی طرف موڑ لیں۔ مگر ابھی تک وہ ناکامی کا منہ دیکھ رہے تھے۔

تھانیدار دولت مند نہیں تھا۔ مگر قانون کو توڑ مروڑ کر دولتمندوں پر حاوی ہو جاتا تھا۔ ایک طرف بوڑھا پٹواری اور حمیدے اس کے رقیب تھے اور دوسری طرف جناب علی اس کا دشمن ـــــ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان میں سے ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن اور رقیب تھا۔

ان کے علاوہ اور بھی جوان تھے جو ریشماں کا خواب دیکھتے تھے۔ اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ مگر بڑے لوگوں کی دولت اور طاقت سے نہیں ٹکرا سکتے تھے۔ اس لئے دور ہی دور سے تماشہ دیکھتے تھے اور ٹھنڈی آہیں بھر کر وہ جاتے تھے۔

ریشماں ٹھنڈی آہ بھر کر سوچنے لگی ـــــ "کیا فائدہ؛ اتنے چاہنے والے ہیں۔ مجھے تباہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ سب کچے گھڑے ہیں۔ سوہنی کو ڈبو سکتے ہیں پار نہیں لگا سکتے ۔ ۔ ۔ ۔"

ڈھولک پر تھاپ پڑ رہی تھی۔ سہاگ کے گیت اس کے دل میں چبھ رہے تھے۔ باہر لاؤڈ اسپیکر سے کبھی شہنائی کی آواز گونجتی تھی اور کبھی

فلمی گانے چیختے تھے۔ پھر اس پر بارش کا شور تھا۔ برساتی ہوائیں جذبات میں آگ لگا رہی تھیں ـــــ اور اتنے ہنگاموں میں کوئی اس کے جذبوں کو سمجھنے والا نہیں تھا۔ اگر اس کے ماں باپ سمجھ بھی رہے تھے تو سمجھ بوجھ کر دل کو بہلا رہے تھے کہ بابل کا آنگن چھوڑنے سے پہلے بیٹیاں اسی طرح روتی ہیں ریشماں اپنی تباہی پر نہیں، ماں باپ کی جدائی کے خیال سے رو رہی ہے۔

عزیز اور رشتے دار اوپر سے مسکرا رہے تھے اپنے آپ کو بہلا رہے تھے سہاگ کے گیت بنو کو کسی گبرو جوان کی خیالی سیج پر لے جا رہے تھے۔ اور اور شہنائی کی آواز ایک ہوک کی طرح کلیجے سے اٹھ رہی تھی۔

پھر اچانک ایک فائر کی آواز گونجی۔

جناب علی کی حویلی میں افراتفری مچ گئی۔ مرد چیخنے اور دشمنوں کو للکارنے لگے۔ عورتیں کھڑکیوں اور چھتوں پر سے جھانکنے لگیں۔

باہر لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گیا تھا۔ دور گلی کے نکڑ پر تھانے دار اپنے مسلح سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا اپنی مونچھ پر تاؤ دے رہا تھا۔ پھر اس نے حویلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ادے ـــــ جناب علی! لاؤڈ اسپیکر لگانے سے پہلے تھانے سے اجازت لینا ضروری ہے تو قانون کے خلاف کام کر رہا ہے۔"

جناب علی اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ گلی میں نکل آیا اور للکار کر بولا۔

"اوے تھانیدارا ۔۔۔ ! قانون کسے سکھاتا ہے۔ میں ضلع کچہری کا پیشکار ہوں، ایسے اجازت نامے میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ادھر آ کر دیکھ اور اپنی مونچھیں نیچی کر کے چلا جا . . . ."

گلی کے دوسری طرف افضل چوہدری کے مکان سے بھی ایک ہوائی فائر ہوا۔ سب نے اس طرف پلٹ کر دیکھا تو حمیدے اپنی چھت پر مسلح آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"جناب علی ۔۔۔ اجازت ہو یا نہ ہو یہ لاؤڈ اسپیکر اتار دے، تجھے شرم نہیں آتی ۔۔۔ سارا ملک سیلاب کی لپیٹ میں آ رہا ہے اور تو یہاں خوشیاں منا رہا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر . . . ."

جناب علی نے جھنجلا کر کہا۔

"اپنے ملک سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو گھر میں گھس کر کیا بیٹھے ہو ۔۔۔ جاؤ سیلاب کو روکو۔ دریاؤں سے لڑو ۔۔۔ مجھ سے کیوں لڑتے ہو ۔۔۔ ؟"

"ہاں ۔۔۔ ہم دریاؤں سے لڑیں گے۔ مگر اکیلے نہیں، تجھے بھی ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔"

جناب علی نے جواب دیا۔

"بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنا میرا فرض ہے۔ پہلے میں اس فرض

کو پورا کر دوں گا۔ پھر تمہارا ساتھ دوں گا۔"

حمیدے نے چیخ کر کہا۔

"نہیں ۔۔۔ ابھی یہ شادی نہیں ہوگی۔ پہلے اس پنڈ کو بچاؤ۔ پھر اپنی بیٹی کو رخصت کرو۔"

تھانے دار اپنی مونچھ پر تاؤ دیتا ہوا مسکرا رہا تھا اور اس انتظار میں کھڑا ہوا تماشہ دیکھ رہا تھا کہ کسی طرح حمیدے اور جناب علی آپس میں لڑ پڑیں، تاکہ امن عامہ کو نقصان پہنچانے کے جرم میں دونوں کو گرفتار کر سکے۔

جناب علی پیشکار قانون کی باریکیوں کو سمجھتا تھا۔ اس لئے دنگے فساد سے حتی المکان کترانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دشمنوں کے سامنے کمزوری دکھانا بھی بزدلی ہے اس لئے وہ بظاہر چیخ چیخ کر انہیں اپنی طاقت اور ٹھوس ارادوں کا یقین دلا رہا تھا۔

حمیدے جوان تھا۔ مگر نادان تھا۔ زور آور تھا، مگر تجربہ کار نہیں تھا۔ اس کے سر میں ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ رشیاں ڈولی میں بیٹھ کر اس پنڈ سے باہر نہ جائے۔ وہ اگر یہاں رہ گئی تو اسے حاصل کرنے کے بہت سے مواقع ہاتھ آ سکتے تھے۔

جناب علی نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"حمیدے ۔۔۔ ! میرے راستے کا پتھر نہ بن ۔۔۔ یاد رکھ تیری بھی ایک

جوان بہن ہے۔ آج میری بیٹی کی ڈولی روکی گئی تو کل تیری بہن کے لئے بھی کوئی بارات نہ آ سکے گی۔"

"او بے خبیث! مجرموں سے رشوت لے کر دولت جمع کرنے والے پٹھکا رہا اپنی گندی زبان سے میری بہن کا نام لے گا تو میں بندوق کی زبان سے بات کروں گا ....."

یہ کہتے ہوئے اس نے گولی چلا دی۔ جناب علی اُچھل کر درخت کی آڑ میں چلا گیا۔ باقی لوگوں نے بھی اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ ایک نوجوان نے حمیدے کی طرف فائر کیا۔ لیکن گولی چھت کی منڈیر سے ٹکرا کر دوسری طرف نکل گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے چھپے ہوئے تھے۔ اور اس موقعہ کی تاک میں تھے کہ کوئی نظر آئے۔ تو فائر جھونک دیں۔ حویلی کے اندر عورتیں چیخ رہی تھیں اور دہائی دے رہی تھیں — شادی کے گھر میں ماتم ہو جائے تو سننے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ لیکن ریشماں کے دل کو ایک عجیب سا سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہے اس فساد میں کہیں سے ایک گولی آ کر مجھے ختم کر دے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس اپنی سہیلیوں کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی اور نیچے گلی کی طرف دیکھنے لگی۔

گلی یہاں سے وہاں تک سنسان پڑی ہوئی تھی۔

پھر سب نے گلی کے نکڑ پر دیکھا۔ جہاں تھانیدار اپنے سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہاں شادو ایک شہری بابو کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ دونوں بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔ شہری بابو سفید وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے دونوں شانوں پر رنگین دھاریوں کا نشان تھا اور بائیں طرف کے سینے پر جو بیج لگا ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی فوج کا جوان ہے۔

اس نے جیب سے کوئی چیز نکال کر تھانیدار کی طرف بڑھا دی۔ تھانیدار اسے غور سے دیکھنے اور پڑھنے لگا۔

"کون ہے یہ ——— !" ریشماں کی ایک سہیلی بڑبڑائی۔

دوسری نے جواب دیا۔

"پتہ نہیں کون ہے شادو اس کی ساتھ ہے۔"

تمام لڑکیوں کے دل میں کھُدبُد سی ہونے لگی کہ شادو اتنی بے باکی سے ایک شہری جوان کے ساتھ کہاں سے آ رہی ہے؟

پھر سب نے بڑی حسرت سے چونک کر دیکھا۔ تھانیدار اور تمام سپاہی اٹینشن ہو کر اس نوجوان کو سلیوٹ کر رہے تھے۔

گلی کے ایک سرے سے دوسرے تک سرگوشیاں مکھیوں کی طرح بھنبھناتی چلی گئیں۔

"کون ہے یہ ۔۔؟"

"کوئی بہت بڑا افسر ہے اسی لئے تو تھانیدار سلام کر رہا ہے۔"

"مگر یہ شادو اس کے ساتھ کیوں ہے؟"

ہر ایک کے ذہن میں شادو ایک نوکیلے سوال کی طرح چبھ رہی تھی۔ پھر گلی کے سناٹے میں جناب علی کی آواز گونجی۔

"میں نے پہچان لیا ۔۔۔ ارے یہ تو اپنا ساجد ہے۔ مائی خیراں کا بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔!"

ساجد ۔۔۔ ساجد ۔۔۔ ساجد ۔۔۔ تمام مرد اور عورتوں کے سر کھڑکیوں اور دروازوں سے نکل آئے ۔۔۔ ریشماں کی نظریں بھی، اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ایک سہیلی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہائے ۔۔۔ یہ تو شادو کا منگیتر ہے۔"

ریشماں کا دل اچانک دھڑکنے لگا ۔۔۔ ہائے منگیتر ایسے ہوتے ہیں ۔۔؟ کیسا گبرو جوان ہے ۔۔۔ اونچا قد، فولادی سینہ، ہتھیاروں سے زیادہ مضبوط بازو ۔۔۔ وہ پُر وقار انداز میں چل رہا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے لڑکیوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ سب کی نظریں اس پہ تھیں اور اس سے زیادہ شادو پہ تھیں، کیا مرد اور کیا عورتیں، سب ہی اس کی خوش نصیبی پہ رشک کر رہے تھے اور ایک غریب کسان کی بیٹی کو

ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ پہلی بار حیران نظروں سے ۔۔۔ پہلی بار تعریفی نظروں سے ۔۔۔ ایسی تعریفی نظروں سے جیسے وہ یہاں کی حسین ترین لڑکی ہو۔

حالانکہ وہ ریشماں سے زیادہ حسین نہیں تھی۔ مگر ریشماں کو آج اس حقیقت کا پتہ چلا کہ عورت خود حسین نہیں ہوتی، مرد کی پُر وقار شخصیت اسے حسین اور بے مثال بنا دیتی ہے ۔۔۔ ساجد کی شخصیت نے بھی شادو کو اس قدر حسین اور دلچسپ بنا دیا تھا کہ لوگوں کے ذہن کی تختی سے ریشماں کا نام دھندلا پڑ گیا تھا اور شادو کا نام جگمگانے لگا تھا۔

ریشماں حسد کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ لیکن شادو کی خوش نصیبی کو دیکھ کر اپنی بد نصیبی پہ اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ساجد اور شادو کو دیکھنے لگی۔

اس وقت وہ دونوں تھانیدار کے ساتھ حویلی کے سامنے آگئے تھے۔ جناب علی آگے بڑھ کر ساجد کو بیٹا کہتے ہوئے گلے لگا رہا تھا اور خوشامدانہ انداز میں اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔ شادو سر جھکا کر اپنے مکان کی طرف جا رہی تھی۔ اور تھانیدار، حمیدے کے مکان کی جانب چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"اوئے چوہدری ۔۔۔ اپنے بیٹے کے ساتھ باہر آجا ۔۔۔ کیپٹن صاحب کا حکم ہے کہ اس علاقہ کی تمام بندوقیں اور خطرناک ہتھیار رکھنے

میں جمع کر دیئے جائیں . . . "

تھانیدار ایک فوجی کیپٹن کا حکم سنا رہا تھا اور افضل چوہدری کو باہر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ جہاں ابھی خون کی ندیاں بہنے والی تھیں، وہاں اب اچانک غیر متوقع طور پر امن قائم ہو رہا تھا۔ لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں سے باہر آ رہے تھے اور ساجد کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

جس مکان میں شادو گئی تھی، اسی مکان سے مائی خیراں بیٹے کو خوشی سے پکارتی ہوئی باہر آئی۔ ساجد دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔ تمام لوگ مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اور ساجد کو اتنا بڑا افسر بننے پر مبارکباد دے رہے تھے۔

افضل چوہدری اپنے بیٹے کے ساتھ باہر آیا اور ساجد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"ارے ساجے . . . . !"

پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اب وہ محض ساجے نہیں، ایک فوجی کپتان ہے اس نے جلدی سے بوکھلا کر کہا۔

"مم ——— میرا مطلب ہے کہ ساجد بیٹے ——— تم تو اس وردی میں پہچانے نہیں جاتے۔ کیسے گبرو جوان نظر آتے ہو . . . . "

ساجد آگے بڑھ کر افضل چوہدری کے گلے لگ گیا۔ یہاں سب اس

کے اپنے تھے۔ کوئی اس کا دشمن نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی سے دشمنی کرنا چاہتا تھا۔

حمیدے اسے ایک حاسد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے باپ کے گلے لگتے دیکھ کر وہ بھی مسکراتے ہوئے اس کے قریب آیا اور اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے یہاں آ کر ایک بہت بڑے فساد کو روک دیا تھا۔ میں جناب علی کو سمجھا رہا تھا کہ یہ شادی بیاہ کا وقت نہیں ہے ابھی ہمارا فرض ہے کہ اس پنڈ کو سیلاب سے بچائیں . . . . "

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے" ساجد نے اس کی تعریف کی، پھر اس نے تمام لوگوں کو بلند آواز سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھائیو، دوستو اور عزیزو ——— ! میں آپ سب لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ وقت کی نزاکت کو سمجھیں، سیلاب نے اس طرف رُخ پھیر لیا تو اس پنڈ کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے اور بیمار لوگوں کو یہاں سے بچا کر لے جانا ناممکن ہو جائے گا ——— یہ نہ سوچنے کا وقت ہے اور نہ سمجھانے کا ——— اس لئے میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے اندر آپ تمام لوگ دریا کے کنارے پہنچ جائیں۔ ہم دور دور تک ایک ایسا بند باندھیں گے کہ دریا کا پانی ہماری طرف رُخ نہیں کرے گا۔"

تمام لوگ خوش ہو کر یک آواز کہنے لگے۔

"ہم بند باندھیں گے ہم دن رات محنت کریں گے . . ."

ساجد نے کہا۔

"یہاں جو لوگ بہت بوڑھے ہیں اور بیمار ہیں، وہی یہاں رہیں۔ باقی لوگ اپنے اپنے گھروں سے کدالیں، پھاوڑے اور ٹوکریاں لیکر چلنے کیلئے تیار ہو جائیں۔"

حمیدے نے جناب علی سے کہا۔

"جناب علی ـــــ میں اور میرے تمام آدمی جائیں گے تم بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ چلو . . ."

جناب علی شش و پنج میں رہ گیا اور بے بسی سے ساجد کو دیکھنے لگا۔

ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"اس گھر میں شادی ہو رہی ہے۔ ایک شریف لڑکی کو رخصت کرنے کی تمام تیاریاں ہو چکی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شادی کسی وجہ سے اگر رُک جائے تو دنیا والے ایک شریف لڑکی میں بھی عیب نکالنے لگتے ہیں۔ اسلئے یہ شادی نہیں رُکے گی . . ."

جناب علی کا چہرہ خوشی سے کھِل گیا۔

حمیدے کے تیور بدل گئے۔

تھا نیدار دل ہی دل میں ساجد کو گالیاں دینے لگا۔

اور اوپری منزل کی کھڑکی پر کھڑی ہوئی ریشماں پریشان نظروں سے ساجد کو دیکھ رہی تھی ـــــ وہ بڑے تجربہ کی باتیں کر رہا تھا ـــــ لیکن اسے اس حقیقت کا تجربہ نہیں تھا کہ بعض ڈولیاں لڑکیوں کے لئے جنازہ بن جاتی ہیں۔

ابھی جو ایک آس بندھی تھی کہ یہ شادی رُک جائے گی۔ وہ آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔

ریشماں کا دل ڈوبنے لگا ـــــ اس کے جی میں آ رہا تھا کہ ابھی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر گلی میں ساجد کے قدموں پر جا گرے اور تڑپ تڑپ کر جان دیدے۔ تاکہ اسے لڑکیوں کے دلوں میں بھی جھانکنے کا تجربہ ہو جائے۔

ایک عجیب سا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا ـــــ کیا اُس کی موت پر ساجد کو افسوس ہوگا ؟ ـــــ افسوس کیوں ہوگا ـــ وہ اس کی کیا لگتی ہے ـــــ ؟ ہاں، شادو کی آنکھ میں آنسو بھی آ جائے تو ساجد تڑپ جائے گا۔

ریشماں کے چاہنے والے بہت تھے۔ مگر اس کا درد جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ شادو کے چاہنے والوں کی کوئی فہرست نہیں تھی۔ لیکن اس کے آنسو پونچھنے

والا لاکھوں میں ایک تھا۔

اچانک وہ اپنی سہیلی کو ایک طرف کھینچ کر ہولے سے بولی۔

"مائی خیراں سے بول کہ ذرا اپنی شادو کو یہاں بھیج دے۔"

"کیوں — ؟"

"بس یونہی —— میرا نام نہ لینا . . ."

یہ کہہ کر ریشماں وہاں سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

میں تمہیں آنے والے کل کا سبق
آج پڑھا رہا ہوں۔ اس محبت کے پیچھے
جو بارود چھپی ہوئی ہے۔ اس کی تمہیں
پہچان کرا رہا ہوں۔ آج کا پہلا سبق یہ
ہے کہ سپاہی جب بھی گھر کی دہلیز سے
باہر جائے۔ اس کی واپسی کی اُمید نہ رکھو۔

چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ کنڈوں کی آگ صرف ہانڈی کو ہی نہیں۔ شادو کے جذبات کو بھی دہکا رہی تھی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور ان مسکراتے ہوئے لمحوں کو سوچ سوچ کر شرما رہی تھی۔ جو ساجد کے ساتھ بارش کی پھوار میں گزرے تھے۔

"اللہ تو رحیم ہے، کریم ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تو نے مجھے اچانک اتنی بڑی خوشی دے دی ہے جو دنیا کی ساری دولت سے بھی نہ خریدی جا سکے ـــــ ہائے میں کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ اس پنڈ کے بوڑھے، جوان، مرد

عورتیں اور لڑکے لڑکیاں مجھے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے میں شادو نہیں، کسی ملک کی شہزادی ہوں۔ اس پنڈ کی سب سے معزز لڑکی ہوں۔ کل تک جو لوگ مجھے ایک معمولی کسان کی معمولی بیٹی سمجھ کر دیکھنے بھی نہیں تھے۔ آج مجھے دیکھ دیکھ کر بھی نہیں تھکتے ـــــ میرے سلجے! میرے سپاہی! میں کچھ بھی نہیں تھی۔ تم نے مجھے بہت کچھ بنا دیا۔ تم نے مجھے محبت بھی دی اور عزت بھی ـــــ میں تمہیں کیا دوں؟ ـــــ بولو، تمہارے قدموں پہ جان دے دوں؟"

وہ سوچتے سوچتے مائی خیراں کی آواز سن کر چونک گئی۔ دوسرے کمرے میں وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی۔

"یہاں اکیلے میرا دل گھبراتا تھا۔ اس لئے میں نے بھا سجان اور شادو کو اپنے ہاں بلا کر رکھا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تو یہاں اچانک آ جائے گا۔"

"کیوں ـــــ؟" ساجد نے پوچھا۔ "میرے یہاں آنے سے کیا فرق پڑ گیا۔؟"

"شادو کوئی غیر تو نہیں ہے میرے چچا کی لڑکی ہے۔ . . . ."

"لیکن تیری منگیتر بھی تو ہے۔ دنیا والے کہیں گے کہ شادی سے پہلے ہی لڑکے لڑکی ایک گھر میں رہنے لگے ہیں"

شادو اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کی اوٹ سے انہیں دیکھنے لگی۔ ساجد ماں کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔"

"ماں تو نے اتنی اچھی لڑکی پسند کی ہے کہ بس میں تیری پسند

کی تعریف نہیں کر سکتا۔"

"تجھے بہت پسند ہے ؟"

"بہت — اب اسے یہاں سے نہ جانے دے ماں . . . ."

ماں نے مسکرا کر کہا۔

"تیرے پیروں میں زنجیر پڑ ہی گئی ہے۔ تو میں اسے نہیں جانے دوں گی۔"

"یہ زنجیر اور زیادہ مضبوط ہو سکتی ہے۔" ساجد نے کہا۔

"وہ کیسے — ؟"

"وہ ایسے کہ آج ہی ہمارا نکاح پڑھوا دے۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے ؛ پہلے تو شادی کے لئے راضی نہیں ہوتا تھا۔ اور اب ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا ہے جیسے کل ہی واپس جانا ہو —"

"اگر تو میری بات نہیں مانے گی تو میں کل ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

"دیکھ ساجے — واپس جانے کی دھمکی نہ دیا کر — ایک تو برسوں کے بعد آتا ہے۔ اوپر سے رعب دکھاتا ہے۔"

ساجد کی نظر دروازے پر گئی اور شادو سے ٹکرائی۔ وہ آنچل کا پردہ کر کے مسکرانے لگی۔ ساجد نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تجھے دھمکی نہیں دیتا ماں — سچ کہتا ہوں مجھے صرف چھ دن کی چھٹی ملی تھی۔ دو دن کراچی سے آنے میں لگے۔ دو دن جانے میں لگیں گے۔ رہ گئے دو دن — تو میں زیادہ سے زیادہ کل تک رہوں گا اور پرسوں چلا جاؤں گا۔ . . ."

شادو کا دل ڈوبنے لگا — یا اللہ ! یہ ساری خوشیاں کیا صرف دو دن کے لئے تھیں — ؟"

ماں نے بگڑ کر پوچھا۔

"تجھے نہ آنا تھا — نہ آتا — یہ دو دن کے لئے آنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

شادو بھی اسے شکایت بھری نظروں سے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اب تب میں رو پڑے گی۔ ساجد نے مسکرا کر ماں سے کہا۔

"تو نے خط میں لکھا تھا کہ آ کر لڑکی دیکھ لو — میں نے دیکھ لی۔ اب اگر شادی ہو گئی تو میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا — نہ ہوئی تو تو یہاں بہو کو کلیجے سے لگائے بیٹھی رہنا۔ سال دو سال کے بعد کبھی چھٹی ملے گی تو آ جاؤں گا۔"

ماں نے جھنجھلا کر کہا۔

"لڑکے تو نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"الجھن کیسی ماں — سیدھی سی بات ہے۔ نکاح پڑھا دے۔ پرسوں ہم شادو کو لے کر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"مگر بیٹا — ! اتنی جلدی شادی کا انتظام کیسے ہو گا۔؟"

"انتظام کیا کرنا ہے۔ مسجد سے مولوی صاحب آئیں گے اور نکاح پڑھا دیں گے۔ چار آدمی آ کر کھائیں گے اور مبارکباد دے کر چلے جائیں گے۔ رہ گئی گانے بجانے اور خوشیاں منانے کی آرزو — تو یہ آرزو ایسے حالات میں مناسب نہیں ہے۔ میں نے جناب علی کو بھی سمجھا دیا ہے کہ بیٹی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے کا فرض پورا کرنا ہے۔ تو یہ فرض موجودہ حالات میں جتنی خاموشی سے ادا ہو جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے — دیکھتی نہیں — وہاں سے بھی اب گانے بجانے کی آواز بالکل بند ہو گئی ہے۔"

ماں سوچ میں پڑ گئی۔ شادو دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ ساجد پرسوں نہ جائے اور اگر جائے تو اسے دلہن بنا کر ساتھ لے جائے۔

ماں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ارے ساجے — تو اگر دو دن کے لئے آیا ہے تو پھر سارے پنڈ والوں کو دریا کی طرف کیوں لے جا رہا ہے کیا یہاں سے ادھورا

کام کر کے جائے گا؟"

ساجد ماں کے اس سوال پر گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"نہیں ماں — کام ادھورا نہیں رہے گا۔ میں ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دوں گا۔ کل تک یہاں کئی فوجی جوان پنڈ والوں کی مدد کے لئے پہنچ جائیں گے۔ تو اس کام کی فکر نہ کر اس کام کی فکر کر، جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔"

ماں بڑبڑانے لگی۔

"تیرا ہر کام سپاہیوں کی طرح کھڑے کھڑے ہوتا ہے۔ میرے دل کے ارمان دل میں ہی رہ جائیں گے۔ نہ بارات سجے گی نہ ڈولی کہیں سے آئے گی۔ لڑکا بھی یہاں اور لڑکی بھی یہاں — کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ تجھے اب آزاد بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ تو یہاں سے گیا تو پھر نہ جانے کب آئے گا — نہیں، میں بہو کو ساتھ لے کر تیرے ساتھ جاؤں گی — ٹھہر جا، میں ذرا اس کے باپ سے بات کر لوں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی شادو کے باپ کے پاس دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ساجد اس کمرے کا دروازہ بند کر کے دوسرے دروازے پر آیا۔ جہاں شادو کھڑی ہوئی تھی۔

"شادو — !" اس نے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

شادو کے دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔

"تم ۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے ۔۔۔؟"

ساجد نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اس دل کی دھڑکن سے پوچھو ۔۔۔ کیا یہ تمہیں چھوڑ کر جا سکتا ہے ؟"

"اور وہ، جو تم ماں سے کہہ رہے تھے ؟"

"وہ میں نے جھوٹ کہا تھا۔ میں تو ایک ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہوں۔"

"سچ ۔۔۔!" شادو کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

ساجد نے اس کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں سجا کر کہا۔

"ہاں شادو ۔۔۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمیں اس گھر میں ایک ساتھ رہنا ہے اگر شادی سے پہلے ہم بہک گئے تو یہ بُری بات ہوگی۔"

"تمہیں میری عزت کا کتنا خیال ہے ساجے ۔۔۔!"

"تم میری عزت جو ہو ۔۔۔ اسی لئے میں نے ماں سے جھوٹ کہا ہے کہ میں پرسوں چلا جاؤں گا ۔۔۔ میری ماں بہت بھولی ہے۔ دیکھ لینا، وہ کتنی جلدی ہمارا نکاح پڑھانے کی کوشش کرے گی۔"

"ساجے ۔۔۔!" وہ لہرا کر اس کے سینے سے لگ گئی ۔۔۔ "تم مجھ سے اتنی محبت کرو گے تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے تم پگلی اور میں دیوانہ ۔۔۔ دنیا والے کہیں گے۔ خوب جوڑی ملی ہے"

وہ ہنسنے لگی۔

"تم مجھے ہمیشہ اپنے پاس رکھو گے نا ۔۔۔؟"

"ہاں، ہمیشہ اس طرح رکھوں گا جس طرح دل سینے کے ساتھ رہتا ہے۔"

"کبھی مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے نا ۔۔۔؟"

"کوئی اپنی خوشی کو اپنی خوشی سے نہیں چھوڑتا ۔۔۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا ۔۔۔ ویسے ابھی تو چھوڑ کر جانا ہی ہوگا۔ تمام لوگ دریا پر پہنچ رہے ہوں گے۔"

"اللہ ! میں کس دل سے کہوں کہ چلے جاؤ !"

"اس دل سے کہو، جو سپاہی کی بیوی کے سینے میں ہوتا ہے۔ شادو! میری زندگی میں آنے کے بعد تمہیں بہت سی آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔ آج تمہارا دل میری محبت سے بہل رہا ہے، کل اسی دل کو میرے فرض کے لئے پتھر بنانا پڑے گا۔ میرے ہاتھوں میں رائفل دے کر کہنا

پڑے گا کہ لام پر جاؤ اور دشمن کو پیٹھ دکھا کر نہ آؤ . . . "

" اللہ ! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو ؟"

" میں تمہیں آنے والے کل کا سبق آج پڑھا رہا ہوں۔ اس محبت کے پیچھے جو بارود چھپی ہوئی ہے۔ اس کی تمہیں پہچان کرا رہا ہوں۔ آج کا پہلا سبق یہ ہے کہ سپاہی جب بھی گھر کی دہلیز سے باہر جائے اس کی واپسی کی امید نہ رکھو . . . "

شادو کا کلیجہ کانپ گیا ـــ اس کا سپاہی اسے بڑا ہی آزمائشی سبق پڑھا رہا تھا ـــ وہ اس کے لئے جان بھی دے سکتی تھی ـــ اس لئے اس کی نصیحت کو اس کا حکم سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ ابھی اندر سے اسے پتھر بننا نہیں آیا تھا۔ مگر اوپر سے ذرا پتھر بن گئی۔

" ایسے نہیں ـــ !" ساجد نے کہا ـــ " اوپر سے پتھر نہ بنو۔ ہر حال میں مسکراتی رہو ـــ چلو مسکراؤ !"

اُف ـــ اندر آنسو رکھ کر اوپر سے مسکرانا ـــ یہ کیسی جان لیوا آزمائش ہے ـــ اس آزمائش پر تو پورا اترنا ہی پڑے گا ـــ وہ جبراً مسکرانے لگی۔

ساجد نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

" پگلی کہیں کی ـــ ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ میں لام پر تو نہیں جا رہا

ہوں ـــ "

وہ بھی ہنسنے لگی ـــ سچ تو یہ ہے وہ لام پر نہیں جا رہا تھا مگر اس کی باتوں سے کہیں گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ شادو کو یوں لگا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہو۔

وہ اپنی حماقت پر ہنستی چلی گئی۔

ساجد نے کہا۔

" مجھے رُلانا بھی آتا ہے اور ہنسانا بھی ـــ اچھا اب میں جاتا ہوں ـــ "

وہ دونوں ہاتھوں سے شادو کا دایاں ہاتھ تھام کر جھکا اور اس کی ہتھیلی کی پشت پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے ـــ شادو نے اپنے بائیں بازو میں اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ وہ بوسہ ایک بارودی سرنگ کی طرح سارے جسم میں سلگتا جا رہا تھا۔

ساجد نے اس شرمیلی لڑکی کو بڑی محبت سے مسکرا کر دیکھا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح اپنے بازو میں منہ چھپائے کھڑی رہی اور اندر ہی اندر اپنے چور جذبات کو بہلاتی، پھسلاتی اور انہیں تھپک تھپک کر سلاتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلی کی پشت کو

دیکھا، جہاں وہ پیار ابھی تک سُلگ رہا تھا۔

بوسہ صرف محسوس کیا جاتا ہے۔ مگر وہ تصور کی آنکھ سے اُسے دیکھ بھی سکتی تھی۔ اور اس لئے وہ اس ہتھیلی کو دیکھ دیکھ کر شرما رہی تھی۔

پھر اس نے اس ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ سے تھام کر اپنے سینے پر یوں رکھ لیا۔ جیسے پیار کی امانت کو دل کی تجوری میں رکھ رہی ہو۔

اسی وقت ماں کی آواز سنائی دی۔

"نی شادو — !کہاں چلی گئی ؟"

شادو نے بدحواسی میں جلدی سے اس ہاتھ کو پیچھے چھپا لیا۔

ماں نے قریب آکر کہا۔

"میں تجھ سے کہنا ہی بھول گئی، وہ جناب علی کے ہاں لڑکیاں تجھے بلا رہی ہیں۔"

"بلانے دے ماں — اب تو سب ہی بلائیں گی۔ پہلے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔"

ماں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، اب تو سب ہی تجھے پوچھ رہے ہیں۔ جانتی ہے کیوں ؟"

وہ شرما گئی۔

ماں کے اس سوال کا جواب اس کی ہتھیلی کی پشت پر تھا جسے وہ چھپا رہی تھی۔

"بیٹی — اللہ عزت دے تو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے — جا، تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر آجا — ورنہ لڑکیاں کہیں گی — کہ شادو مغرور ہوگئی ہے۔"

"جی — اچھا — میں چلی جاتی ہوں . . ."

ماں نے اسے غور سے دیکھا — وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی — پھر وہ بہو کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"یہ تو پیچھے ہاتھ رکھے کیوں کھڑی ہے ؟"

ہتھیلی کی پشت پر وہ شریر بوسہ دنگ دینے لگا۔ وہ گھبرا کر بولی۔

"جی کچھ نہیں — کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہم — !" ماں نے سر ہلا کر کہا — "سمجھی، بیر چھپا کر کھا رہی ہو۔"

"جی نہیں — بیر نہیں ہیں . . ."

"پھر کیا ہے بتا — !"

ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کر لیا — وہاں ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں تھا — پھر وہ کیا چھپا رہی تھی ؛ ماں اسے حیرت سے تکنے لگی۔

شادو بھی اپنی بدحواسی سے ذرا سنبھلی — ہتھیلی کی پشت پر کچھ نہیں تھا — مگر بہت کچھ تھا — الوداعی بوسے کو بھلا کون دیکھ سکتا ہے — وہ تو صرف دل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ہتھیلی کی خوشبو ایسی تھی جسے صرف وہی محسوس کر سکتی تھی — خوشبو کے اس خزانے کو بھلا چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ دونوں ہتھیلیوں سے اپنا منہ چھپا کر اپنی حماقت پر ہنسنے لگی۔

ماں نے اسے تعجب سے دیکھ کر کہا۔

"اے لڑکی — کیا پاگل ہو گئی ہے ؟"

وہ دل ہی دل میں ہنستی ہوئی بولی۔

"کیا واقعی میں پاگل ہو گئی ہوں — اگر یہی پاگل پن

ہے کہ خدا مجھے ایسے ہی پاگل بنائے رکھے ...."

وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔

وہاں سے بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"تیری ٹھنڈی آہوں سے میرا کلیجہ
کانپ جاتا ہے۔ فکر نہ کر میری بچی ۔ !
تیرے بھی نصیب جاگنے والے ہیں۔"
ریشماں نے آنسو بھرے لہجے میں کہا
"سوئے ہوئے نصیب جاگتے ہیں
میرے نصیب تو مر چکے ہیں . . . "

حویلی کے دروازے پر شادو کے آتے ہی ہلچل سی مچ گئی ۔
"شادو آئی ہے ـــــ شادو آئی ہے . . . . ." حویلی کے اندر اور باہر ایک شور برپا ہو گیا ۔
جناب علی دوڑتا ہوا دروازے پر آیا اور شادو کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا ۔
" آؤ بیٹا ـــ آؤ ـــ یہ تو تمہارا ہی گھر ہے ۔ شادی کی دعوت غیروں کو دی جاتی ہے ۔ تم تو میری بیٹی ہو ۔ اسی لئے تمہیں دعوت نہیں دی تھی کہ تم خود ہی اپنا گھر سمجھ کر آ جاؤ گی ۔"
شادو اس کی خوشامدانہ باتوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی ۔ یہ وہی جناب علی تھا جس نے اسے ایک غریب کسان کی بیٹی سمجھ کر اپنے ہاں دعوت

نہیں دی تھی۔ اور اب وہی اُسے اپنی بیٹی بنانے میں فخر محسوس کر رہا تھا۔

حویلی کے اندر ریشماں کی ماں نے اس کی بلائیں لیں اور بڑی حسرت سے کہنے لگی۔

"جیسے تیرے نصیب بدلے ہیں۔ اللہ ویسے ہی میری بیٹی کے نصیب بدلے ....."

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

"اب ریشماں کے نصیب کیا بدلیں گے۔ اس نصیبوں والی کو بوڑھے کے ہاتھوں میں دیکر تم ہی لوگ اسے بدنصیب بنا رہی ہو۔"

ریشماں کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے شکایت بھری نظروں سے جناب علی کو دیکھا ـــــ شادو آگے بڑھ گئی۔ لڑکیاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیکر ریشماں کے کمرے کی طرف جانے لگیں۔

اس کے جانے کے بعد ریشماں کی ماں نے اپنے خاوند سے کہا۔

"ہمارے پاس دولت کی کیا کمی تھی ـــــ؟ مگر اتنی دولت ہوتے ہوتے بھی تم ریشماں کی تقدیر کو نہ بنا سکے۔"

جناب علی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تم کیا جانو ـــــ دولت سے ہی تقدیر بنتی ہے۔ پٹواری کی کم ذرا زیادہ ہو گئی تو کیا ہوا۔ یہ دیکھو کہ اس کی دولت اس کی عمر سے زیادہ

"آگ لگے ایسی دولت کو ـــــ" ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ "ساجے دولت مند نہیں ہے لیکن تمہارے جیسے ہزاروں دولتمند اسکے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی بیوی کو عزت بھی دے سکتا ہے۔ محبت بھی دے سکتا ہے اور زندگی کی خوشیاں بھی ....."

"اور نہیں تو کیا ـــــ؟" ریشماں کی ماں نے کہا۔ "کیا ہماری ریشماں کو ایسا اچھا لڑکا نہیں مل سکتا تھا ـــــ شادو کی اوقات ہی کیا ہے۔ وہ دو ٹکے کی چھوکری اس کی منگیتر بنکر پلک جھپکتے ہی عزت والی بن گئی ہے۔"

"اونہہ ـــــ!" بوڑھی عورت نے کہا۔ "شادو تو ہماری ریشماں کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے ـــــ ساجے اگر آپ ایک بار ریشماں کو دیکھ لے تو اس دروازے کا بھکاری بنکر رہ جائے ....."

جناب علی نے چونک کر بڑھیا کو دیکھا۔ اُسے بڑھیا کی بات بڑی عجیب لگی۔ اور بڑی اچھی لگی ـــــ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ساجد جیسا فوجی افسر اسکے دروازے کا بھکاری بن جائے۔ بیٹی خوبصورت ہو تو داماد بھکاری بنکر آتے ہیں ـــــ اگر ساجد داماد بن جاتا تو دُور دُور تک جناب علی کی دھاک بیٹھ جاتی ـــــ کوئی حمیدے اور کوئی تھانیدار اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت بھی نہ کرتا۔

مگر یہ صرف خیال ہی خیال تھا۔ پرسوں پٹواری بارات لیکر آنے والا تھا۔ پنڈ کے سارے لوگ جانتے تھے کہ ریشماں پٹواری سے منسوب ہو رہی ہے۔ جناب علی

اب اپنی زبان نہیں بدل سکتا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔

" اب تو جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ساجے اتنا بڑا افسر بنکر

آئے گا ـــ

آئے گا ـــ اری ریشماں کی ماں! اُسے داماد بنا کر تو میں سات پنڈ کا بادشاہ

بن جاتا۔ مگر افسوس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

بڑھیا نے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔

"ارے افسوس کس بات کا کر رہا ہے ـــ ؟ ابھی ریشماں کی شادی نہیں

ہوئی ہے۔ تو چاہے تو پرسوں بارات آنے تک بہت کچھ کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔"

جناب علی اور اس کی بیوی معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے

لگے۔

جناب علی نے بڑھیا سے کہا۔

"سرداراں ـــ تو نے دنیا دیکھی ہے۔ بتائیں کیا کروں ؟"

سرداراں نے ہولے سے کہا۔

"کرنا کیا ہے ـــ ریشماں کو ایک بار ساجے کے سامنے کر دے،

میں دعوے سے کہتی ہوں کہ ساجے دیوانہ بنکر رہ جائیگا۔ پھر پٹواری کے

خبر بھیج دینا کہ لڑکی راضی نہیں ہے۔ زہر کھا کر جان دینا چاہتی ہے۔ ہمیں ا

بیٹی کی زندگی عزیز ہے اس لئے یہ رشتہ نہیں ہوگا۔"

ریشماں کی ماں نے گھبرا کر کہا۔

" مگر سرداراں ـــ پٹواری ہمارا دشمن بن جائے گا۔"

" یہاں دشمن کون نہیں ہے۔ افضل چوہدری، حمیدے، تھانیدار ـــ

ان سب لوگوں نے تمہارا کیا بگاڑ لیا ہے۔ پھر پٹواری کو جب معلوم ہوگا کہ

ریشماں ایک فوجی افسر سے بیاہی جا رہی ہے تو وہ تلملا کر رہ جائے گا۔ ساجے

کے ڈر سے تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

ریشماں کی ماں اور جناب علی خوش ہو کر مُسکرانے لگے اور سرداراں کی

باتوں پہ مزید غور کرنے لگے۔ پھر جناب علی نے کہا۔

" سرداراں ـــ تیری ہر بات سولہ آنے ٹھیک ہے۔ لیکن ساجے اگر

ارادے کے پکا ہوا اور رشادو کو چھوڑ کر ریشماں سے شادی کے لئے تیار نہ ہوا

تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے کیسے تیار نہ ہوگا۔؟" سرداراں نے کہا۔" بڑے بڑے تیس مار خاں

عورت کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ تو ابھی دریا پہ جا اور کسی طرح ساجے

کو آج رات یہاں کھانے پہ آمادہ کر لے ـــ وہ اس حویلی کے اندر آگیا تو

باقی کام میں خود سنبھال لوں گی۔"

جناب علی نے کہا۔

" اچھی بات ہے۔ وہ میری دعوت ضرور قبول کرے گا۔ میں ابھی اس سے

جاکر ملتا ہوں۔"

سرداراں نے کہا۔

"اور ہاں اس سے یہ ضرور کہنا کہ حویلی میں بے کھٹکے آ جائے۔ یہاں تم سے کوئی پردہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ تم ہمارے بیٹے جیسے ہو۔۔۔۔۔"

اسی وقت دروازے پر سے مائی خیراں کی آواز آئی۔

"یہ کسے بیٹا بنایا جا رہا ہے؟"

"اے ساجے کی ماں ——!" وہ سب کے سب اس کے استقبال کیلئے آگے بڑھے۔

دلشاں کی ماں نے کہا۔

"ہم تو تیرے ہی بیٹے کو اپنا بیٹا بنا رہے ہیں۔"

سرداراں نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ میں کہہ رہی تھی کہ ایک بیٹے سے بھلا کیا پردہ —— وہ جب چاہے بے کھٹکے یہاں آ سکتا ہے۔"

مائی خیراں نے کہا۔

"بہن، اُسے اتنی فرصت ہی کہاں ہے۔ یہاں آتے ہی دریا پہ چلا گیا۔ میں تو تم لوگوں کو اپنا سمجھ کر ایک بہت ضروری بات کرنے آئی تھی۔"

جناب علی نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تم ہمیں اپنا سمجھتی ہو۔ ہمارے لائق جو بھی خدمت ہو بلا جھجک کہو۔"

"میں ساجے کی شادی کے بارے میں کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔"

مائی خیراں نے کہا۔

"شادی ——!" سرداراں بولی۔ "ہاں ہاں، ساجے کے لیے ایک نہیں ہزاروں لڑکیاں مل سکتی ہیں —— شادو —— نازو —— رضیہ اور تو اور تم چاہو تو دلشاں کو بھی لیجا سکتی ہو۔"

مائی خیراں بوکھلا کر انہیں دیکھنے لگی۔ پھر سنبھل کر بولی۔

"نہیں نہیں —— شادو میری بھتیجی ہے۔ ساجے بھی اسے پسند کرتا ہے۔ میں تو یہ کہنے آئی ہوں کہ کل صبح کو دونوں کا نکاح ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"اتنی جلدی ——؟"

"ہاں —— ساجے کی یہی ضد ہے۔"

"اچھا —— !" جناب علی نے کہا۔ "ساجے کے آگے کس کی چلے گی۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔۔۔۔۔"

مائی خیراں نے کہا۔

"تم ذرا مولوی صاحب سے جا کر کہدو کہ وہ کل صبح آ جائیں۔ لڑکے اور لڑکی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

سردار اں نے چونک کر مائی خیراں کو دیکھا وہ مکاری سے مسکرائی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"بہن ـــــ کل صبح نکاح ہوگا۔ مگر بُرا نہ منانا۔ آج رات لڑکے اور لڑکی کا ایک ہی گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تو ہمیں اپنا سمجھتی ہے تو آج کی رات ساجے کو جناب علی کا بیٹا بنا دے۔ وہ یہاں رہیگا اور کل صبح ہم ساجے کی بارات لیکر شاد کو بیاہنے آئیں گے۔"

"واہ کیا بات کہی ہے تو نے ـــــ!" جناب علی نے خوش ہو کر کہا۔ "نظام سقہ کو ایک دن کی بادشاہت ملی تھی۔ ہمیں ایک رات کے لئے ساجے جیسا بیٹا مل جائے گا۔ ہم سمجھیں گے کہ ہمیں بادشاہی مل گئی ہے۔"

پھر اس نے مائی خیراں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بہن ـــــ! جب ہمیں اپنا کہا ہے تو پھر ہماری بات مان لے۔ ساجے کو آج کی رات ہمارے ہاں رہنے دے۔ رات کا کھانا بھی وہ ہمارے ہی ساتھ کھائے گا۔"

مائی خیراں نے مسکرا کر کہا۔

"تم لوگ اتنی محبت سے کہہ رہے ہو تو میں انکار نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی شاد و ایک لڑکی ہے۔ اسے میں دوسروں کے ہاں نہیں چھوڑ سکتی۔ ساجے ہی آج کی رات تمہارے ہاں رہ جائے گا۔"

سرداراں نے مائی خیراں کو گلے لگا لیا۔ جناب علی، ساجد سے ملنے کے لئے دریا کی طرف جانے لگا۔ رلیشاں کی ماں حیران اور پریشان کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ساجے کو ایک رات کے لئے بیٹا بنا لینے سے کون سا فائدہ حاصل ہو جائیگا ـــــ کیا وہ شاد کو بھول کر رلیشاں سے شادی کر لے گا؟

ماں کو اپنی بیٹی کی خوبصورتی پر ناز تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اس رشتے کی کامیابی کا نہیں آ رہا تھا۔

شادو تمام لڑکیوں کے درمیان گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ حالانکہ وہ سب اُسکے بچپن کی سہیلیاں تھیں اِن کے ساتھ کھیل کود کر وہ جوان ہوئی تھی۔ جوانی میں کچھ سہیلیاں بچھڑ گئی تھیں کچھ مغرور ہوگئی تھیں اور اس سے دُور دُور رہتی تھیں۔ مگر آج سب اپنے غرور کو بھول کر اس کے قریب ہوگئی تھیں اور اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھیں۔

"ساجے سے بڑا میل جول ہے کیا وہ تمہیں خط لکھا کرتا تھا؟" ایک لڑکی نے پوچھا

"نہیں ——!" شادو نے جواب دیا۔ "میں نے تو صرف انہیں بچپن میں دیکھا تھا۔"

دوسری نے کہا۔

"مگر تم دونوں ایسے ساتھ آئے تھے۔ جیسے برسوں کی پہچان ہو۔"

وہ جواب نہ دے سکی۔ شرمانے لگی۔

ریشماں نے ہولے سے کہا۔

"اور تم دونوں بارش میں بھیگے ہوئے بھی تھے۔"

ایک اور لڑکی نے شرارت سے پوچھا۔

"بارش نے بھگایا تھا یا ساجے نے ——— ؟"

شادو شرم سے لال گلنار ہوگئی۔

لڑکیوں نے ہائے کہہ کر اپنے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ریشماں بڑے غور سے اور بڑی حسرت سے اسے دیکھ رہی تھی ——— ایک خوبرو نوجوان کا خواب ہر لڑکی کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ شادو کے سامنے یہ خواب حقیقت بنکر آگیا تھا اور یہی خواب ابھی تک ریشماں کی آنکھوں میں ایک بھانس کی طرح چبھ رہا تھا ——— "ہائے میرے خوابوں کا شہزادہ کہاں گم ہوگیا ——— ؟ کاش کہ کوئی ساجے میری زندگی میں بھی اسی طرح آتا اور بارش میں بھگا کر مجھے نہال کر دیتا . . . . . "

لڑکیاں چھیڑتی رہیں ——— شادو لجاتی رہی ——— اور ریشماں سوچتی رہی۔

پھر اس نے لڑکیوں سے کہا۔

"اس بیچاری کو کیوں پریشان کر رہی ہو۔ تم سب جاؤ یہاں سے مجھے شادو سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

لڑکیاں اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوئے وہاں سے ایک ایک کر کے چلی گئیں۔

شادو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ریشماں نے بھی کچھ نہ کہا۔ وہ بیچاری اس خوش نصیب لڑکی کو دیکھتی رہی۔ نہ جانے وہ شادو میں کیا تلاش کر رہی تھی۔ شادو میں پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔ اب بھی کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا، وہ ساجے کے دم سے تھا۔ تو کیا وہ شادو میں ساجے کو تلاش کر رہی ہے ——؟

ریشماں اپنے اس خیال پر چونک گئی۔ اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ چوری کر رہی ہے۔ وہ سنبھل کر بولی۔

"تم —— تم کتنی اچھی ہو۔"

"میں اچھی نہیں تھی۔" شادو نے کہا۔ "میرے ساجے نے مجھے اچھا بنا دیا ہے۔"

"کیا وہ تمہیں بہت چاہتا ہے؟"

شادو نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"بھلا کتنا چاہتا ہے ——؟" ریشماں نے پوچھا۔

وہ شرمانے لگی۔

"مجھ سے کیوں شرماتی ہو۔ مجھے اپنی سہیلی سمجھ کر بتاؤ۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔"

وہ شرماتی ہوئی بولی۔

"وہ —— مجھے بہت چاہتے ہیں —— میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ماں سے کہہ رہے تھے آج ہی شادی کر دو . . . ."

"شادی ——!" ریشماں کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ وہ حسد کرنے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اچانک ہی ایک حسد کا جذبہ سلگ اٹھا —— کیا یہ لڑکی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے کہ ساجا اس کے لئے تڑپتا ہے —— اونہہ! نہیں یہ محض باتیں بنا رہی ہے اپنی اہمیت جتا رہی ہے۔ ایک چھوٹی سی کامیابی کو بڑھا چڑھا کر بتا رہی ہے۔

اتنے میں سرداراں وہاں آ گئی۔ اس نے شادو سے کہا۔

"شادو —— تجھے مائی خیراں بلا رہی ہے۔"

وہ اُٹھ کر جانے لگی۔ ریشماں نے پوچھا۔

"پھر آؤ گی نا ——؟"

"ہاں آؤں گی ——!"

وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ سرداراں نے سر جھٹک کر کہا۔

"اونہہ —— کمبخت کے پاؤں زمین پر ہی نہیں پڑتے۔ ساجے کے ساتھ تو ایک ذرا اچھی نہیں لگتی۔"

ریشماں ایک ٹھنڈی سانس لیکر رہ گئی۔

سرداراں اس کے پاس آ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"تیری ٹھنڈی آہوں سے میرا کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ فکر نہ کر میری بچی! تیرے بھی نصیب جاگنے والے ہیں۔"

ریشماں نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

"سوتے ہوئے نصیب جاگتے ہیں۔ مگر میرے نصیب تو مر چکے ہیں۔"

"اے بیٹا تو سرداراں کو سمجھتی کیا ہے۔ میں تو مُردوں کو بھی زندہ کر دیتی ہوں۔ ـــــ ایک بات پوچھتی ہوں سچ سچ بتانا ـــــ کیا ساجے تجھے پسند ہے؟"

ریشماں چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

سرداراں نے مسکرا کر کہا۔

"اچھی طرح سوچ کر جواب دے۔"

وہ ہچکچائی ہوئی بولی۔

"مائی ـــــ تُو ـــــ تُو ایسی باتیں نہ کر ....."

"کیوں تجھے بُرا لگتا ہے؟"

ریشماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ روتی ہوئی بولی۔

"بھلا کیا ہے۔ بُرا کیا ہے ـــ یہ میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ اگر سوچوں گی تو اس بوڑھے پٹواری سے زیادہ بُرا کوئی نہیں لگے گا۔"

"اس پٹواری پر ہزار لعنت ـــــ یہ پھول سا بدن اس بوڑھے خبیث کے لئے نہیں بنا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس کی بارات روک کر ساجے کی بارات یہاں لے آؤں ....."

"ساجے کی بارات ـــــ اور یہاں ـــــ؟"

ریشماں کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں ـــــ ساجے ـــــ ساجے ـــــ اونچا قد ـــــ فولادی سینہ ـــــ ہتھیاروں سے زیادہ مضبوط

بازو ـــــ وہ نگاہوں کے سامنے پر وقار انداز میں چلتا ہوا آ رہا تھا اور ریشماں کو اپنے دل میں اس کے قدموں کی دھمک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بڑی حیرانی سے سرداراں کو دیکھنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ کیوں میرا ایمان ڈگمگا رہی ہے ـــــ؟"

"اس میں ایمان کی کیا بات ہے؟" سرداراں نے کہا۔ "کیا ایمان کی بات ہے۔ کہ تو بوڑھے سے بیاہ دی جائے ـــــ؟ کیا تیرے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا تو کسی خوبصورت دولہے کی تمنا نہیں کر سکتی۔ اگر کرے گی تو کیا ایمان ڈگمگا جائے گا؟"

کیسی نادانی کی بات کرتی ہے ریشماں ـــــ تعجب ہے کہ تجھ میں تیرے باپ کے جیسی سمجھداری اور چالاکی کیوں نہیں ہے۔ وہ تو جہاں چار پیسے کا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہاں داؤ لگا دیتا ہے۔ ساجے کو داماد بنانے میں بڑا فائدہ ہے۔ اسی لئے اب وہ بھی پٹواری پر لعنت بھیج رہا ہے۔"

"سچ ـــــ!" ریشماں کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

"ہاں سچ نہیں تو کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ وہ تو ساجے کو تیرے قدموں میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"مم ـــــ مگر شادو ـــــ؟"

"شادو کو مار گولی ـــــ وہ مٹی کا کیڑا ہے۔ مٹی میں ہی رہے گی۔"

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"لیکن ماتی ـــــ یہ ـــــ یہ تو شادو پر ظلم ہوگا۔"

سرداراں چڑ گئی۔

"اری سارے جہان کا درد تیرے ہی جگر میں ہے؟ تو پھر جا اپنے اوپر ظلم کر ـــــ اس بوڑھے سے شادی کرلے . . . . . "

"نہیں ـــ مجھے اس کے نام سے نفرت ہے۔ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"تو پھر جو موقعہ ہاتھ آرہا ہے اُسے ہاتھ سے نہ جانے دے ـــــ دیکھ ریشماں! تو اپنے باپ کی لالچی طبیعت کو اچھی طرح جانتی ہے۔ اگر تو نے ساجے کو ٹھکرا دیا تو وہ تجھے پٹواری کے پلّے باندھ دے گا۔

میں جاتی ہوں۔ تو جلدی فیصلہ کرکے بتا دینا کہ بوڑھا خبیث پسند ہے یا وہ بانکا سپاہی ـــــ؟۔ مگر ایک بات یاد رکھنا کہ ایمان کے ترازو پر تو نے فیصلہ کیا تو وہ بوڑھی دیمک تیری جوانی کو گھُن کی طرح کھا جائے گی تو گھُٹ گھُٹ کر مرے گی۔"

سرداراں یہ کہہ کر چلی گئی۔

ریشماں آنکھوں پھاڑے سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔

اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے آرزوؤں اور ارمانوں کا ہجوم بھی تھا۔ اور اپنی جوانی کا جنازہ بھی ـــــ اور اس دنیا میں کوئی ایسی احمق لڑکی نہیں ہے جو بھری جوانی میں اپنا جنازہ اٹھانا پسند کرے۔

جناب علی نے طنزیہ لہجے میں کہا
"مطلب کی بات کرو چوہدری!
آخر بات کیا ہے، یہ شیر اور بکری ایک
گھاٹ میں کیوں جمع ہوگئے ہیں۔"

دریا سے ایک میل کی دوری پر مٹی کا پہاڑ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے پتھر جائے جا رہے تھے تاکہ سیلاب مٹی کے تودوں کو کاٹ کر پنڈ کی طرف نہ آئے۔

بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی کاموں میں مصروف تھے۔ ساجد بھی مٹی کھود کر ٹوکریوں میں بھر رہا تھا ـــــ تمام لوگ مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیئے گئے تھے ـــــ کوئی مٹی کھود رہا تھا کوئی مٹی سے بھری ہوئی ٹوکریاں اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ اور کوئی سیلاب کے راستے میں مٹی اور پتھر کی دیوار حائل کر رہا تھا۔

ساجد کام بھی کر رہا تھا اور کام کرنے والوں کی راہنمائی بھی کر رہا تھا۔

حکومت کی جانب سے ایک اسپیشل پولیٹیکل آفیسر بھی آیا ہوا تھا جو بڑی ناگواری سے ساجد کو دیکھ رہا تھا۔ ناگواری کی وجہ یہ بھی کہ ساجد نے اسے بھی عام

مزدوروں کی طرح کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ منہ میں پائپ دبائے، تمباکو کا دھواں چھوڑتے ہوئے حرف حکم صادر کیا کرتا تھا۔ اور لوگوں سے اس طرح کام کراتا تھا جیسے وہ سب زرخرید مزدور ہوں۔ حالانکہ تمام لوگ ایک دوسرے کی بھلائی کے لئے اور انسانی آبادی کو سیلاب سے بچانے کے لئے بغیر کسی معاوضہ کے مجاہدانہ کام کر رہے تھے۔

ایک فوجی اور سول افسر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ سول افسر اپنے ماتحتوں پر حکم چلاتا ہے اور فوجی افسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ خود بھی مزدوری کرتا ہے اور جہاں اصول کی بات آجائے وہاں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ ساجد نے بھی پولیٹیکل آفیسر سے یہی کہا تھا کہ ہم دونوں آفیسر ہیں۔ لہٰذا میں کام کرتا ہوں تو آپ کو بھی کام کرنا چاہیئے۔

اسی لئے وہ بیچارہ بھی دل ہی دل میں کڑھتا ہوا کام کر رہا تھا۔

کام کرنے والوں کی ہر ٹولی کے لئے سات گھنٹے مقرر تھے۔ سات گھنٹے کے بعد پہلی ٹولی کی جگہ دوسری ٹولی آکر کام جاری رکھتی تھی۔ اس وقت پولیٹیکل آفیسر کی ڈیوٹی ختم ہونے والی تھی۔ اور ساجد کو ابھی نو بجے رات تک کام کرنا تھا۔

اسی وقت جناب علی وہاں آکر ساجد سے باتیں کرنے لگا۔

ساجد نے مٹی کی ٹوکریاں بھرنے کے بعد کہا۔

"جنابِ علی! باتیں بھی کرتے جاؤ اور کام بھی —— جب آ ہی گئے ہو تو ایک لکڑی تم اٹھاؤ۔ دوسری میں اٹھاتا ہوں ......"

جناب علی بوکھلا کر کہنے لگا۔

"مم — میں تو بس ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔"

ساجد نے ایک لکڑی اس کے سر پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"جتنی دیر تک وہ ضروری باتیں ہوں گی۔ اتنی دیر میں کام ذرا اور آگے بڑھ جائیگا۔"

اس نے دوسری لکڑی اٹھالی۔ جناب علی طوعاً و کرہاً لکڑی سر پہ رکھ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ساجد بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ اس شادی کے گھر میں کسی مرد کا موجود رہنا ضروری ہے۔ تم مجھ سے باتیں کرنے کے بعد چلے جانا۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا —— ہاں بولو! کیا کہنے آئے ہو۔"

جناب علی لکڑی کے بوجھ سے کراہتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں شادی کی مبارکباد دینے آیا ہوں۔"

"شکریہ —— !"

"تمہاری ماں سے تمام باتیں ہو چکی ہیں۔ صبح شادو سے تمہارا نکاح ہوگا۔"

"صبح کیوں —— آج رات کو بھی نکاح ہو سکتا ہے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے۔ مگر مولوی صاحب کرنالہ گئے ہوئے ہیں۔ صبح آئیں گے۔"

"کیا مصیبت ہے۔ مولوی صاحب کو بھی آج ہی جانا تھا۔ پنڈ میں اور کوئی نکاح پڑھانے والا نہیں ہے؟"

"نہیں —— آج رات تم میری حویلی میں رہوگے۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا ایک ہی گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ دوسری مصیبت ہے۔ کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ شادی سے پہلے میں لڑکی کو کھا جاؤں گا —— ؟"

جناب علی نے جبراً ہنستے ہوئے کہا۔

"دنیاداری بھی کوئی چیز ہے ساجد —— ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ میرے ہاں کوئی تم سے پردہ بھی نہیں کرے گا۔ وہاں تم اپنے گھر کی طرح رہوگے۔ تمہاری ماں سے میں نے کہہ دیا ہے کہ آج رات کا کھانا بھی تم ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔ صبح ہمارے گھر سے تمہاری بارات جائیگی۔"

ان لوگوں نے مٹی اور پتھر سے بننے والی دیوار کے قریب اپنی لکڑیوں کی مٹی پھینک دی۔ ساجد نے کہا۔

"اچھی بات ہے جب آپ لوگوں نے تمام پروگرام بنا ہی لیا ہے تو میں

آپ لوگوں کو مایوس نہیں کروں گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پھر اپنی جگہ واپس آ گئے۔ جناب علی نے لڑکوں کو دیکھ کر کہا۔

"اب مجھے اجازت دو۔ میرا واپس جانا بہت ضروری ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں نو بجے کے بعد آ جاؤں گا۔"

جناب علی اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑتا ہوا اور دل ہی دل میں ساجد کو بُرا بھلا کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ جہاں پولیٹیکل آفیسر ٹھہرا ہوا تھا۔

جناب علی کو دیکھتے ہی اس نے آواز دیکر اُسے بلایا اور ڈاک بنگلے کے اندر چلا گیا۔

"اونہہ ——— ایسے بلا کر چلا گیا جیسے میں اس کا نوکر ہوں۔ یہاں جتنے بھی افسر آتے ہیں۔ سب اسی طرح رُعب جماتے ہیں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا ڈاک بنگلہ کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ پھر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں اس کے دشمن افضل چودری اور تھانیدار بیٹھے ہوئے تھے۔

پولیٹیکل آفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں جناب علی! یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے آؤ یہاں آکر بیٹھو۔ ایک بہت ضروری مسئلہ پر بات کرنا ہے۔"

افضل چودہری نے کہا۔

"میرے لڑکے حمیدے نے کچھ ایسی غلطیاں کی ہیں کہ جناب علی مجھے بھی اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے۔ حالانکہ میں آج بھی اسے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔"

جناب علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مطلب کی بات کرو چودہری! آخر بات کیا ہے۔ یہ شیر اور بکری ایک گھاٹ میں کیوں جمع ہو گئے ہیں؟"

تھانیدار نے اپنی مونچھ پر تاؤ دیکر کہا۔

"گھاٹ کا ہی مسئلہ ہے سیلاب کا رُخ ہمارے باغات کی طرف ہو رہا ہے۔"

جناب علی پریشان ہو کر ایک ایک کے چہرے کو تکنے لگا۔

پولیٹیکل آفیسر نے ایک تہہ کئے ہوئے نقشے کو میز پر پھیلا دیا۔ جناب علی قریب آکر دیکھنے لگا۔ آفیسر نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

"یہ دریا ہے ——— یہ تم لوگوں کا گاؤں ہے۔ اور یہ جنوبی حصہ میں جو بلاٹس ہیں وہ سب تمہارے اور افضل چودھری کے باغات ہیں ——— اگر سیلاب کو تمہارے گاؤں کی طرف آنے سے روکا گیا تو پھر اس کا رُخ تمہارے باغات کی طرف ہو جائیگا۔ اور اگر باغات کو بچایا گیا تو یہ گاؤں سیلاب میں بہہ جاتے گا ——— اب تم لوگ بیٹھ کر فیصلہ کرو کہ سیلاب کا رخ کس طرف ہونا

چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جناب علی اور افضل چودھری ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ تھانیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہزاروں روپے کے باغات ہیں۔ ان باغات کے پھل صرف ہزاروں روپے کا منافع نہیں دیتے بلکہ بڑے بڑے صاحب لوگوں کے پاس تحفے کے طور پر جا کر تم لوگوں کو بے شمار فائدے بھی پہنچاتے ہیں۔ پھر ان باغات کے ایک حصّہ میں ایک خوبصورت عشرت کدہ بھی ہے۔ جہاں شہر کی طوائفیں آکر مجرا کرتی ہیں ۔"

"بکواس مت کرو۔" جناب علی نے میز پہ ہاتھ مار کر کہا۔ "طوائفیں صرف میرے ہاں نہیں آتیں۔ چودھری کے ہاں بھی آتی ہیں۔"

افضل چودھری نے کہا۔

"ہاں تو میں کب انکار کرتا ہوں۔ یہاں ہم سب ایک دوسرے کی اصلیت کو جانتے ہیں۔ اسوقت کچھ چھپانے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے نفع و نقصان کا جائزہ لیں ۔"

"اور یہ بہت ضروری ہے۔" تھانیدار نے کہا۔ "تمہارے باغات سے ہر مہینہ مجھے پانچ سو روپے ملتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری یہ آمدنی ماری جائے۔"

"میں کب چاہتا ہوں کہ میرا نقصان ہو۔" جناب علی نے کہا۔

"کوئی اپنا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔" چودھری نے کہا۔

"لیکن ـــــ!" جناب علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "باغات اگر محفوظ ہو گئے تو پھر ہمارا پنڈ ـــــ؟"

"وہ ڈوب جائے گا ـــــ" پولیٹیکل آفیسر نے کہا۔

"پنڈ کے بارے میں سوچنا فضول ہے۔" چوہدری نے کہا۔ "تمام فصلیں کاٹی جا چکی ہیں۔ آج رات کو میں گندم کی ڈھیری اوپری منزل پر پہنچا دونگا۔"

"میں بھی تمام اناج دوسری منزل پر لے جاؤنگا۔" جناب علی نے کہا۔

مگر ـــــ پنڈ کے لوگوں نے بڑا مضبوط بند باندھا ہے۔ پانی ادھر کیسے آئیگا؟"

"آجائے گا ـــــ!" آفیسر نے کہا۔ "کیپٹن ساجد نے مجھے ذلیل کیا ہے میں حکومت کے سامنے اسے ذلیل کروں گا۔ میں شکایت کروں گا کہ کیپٹن نے میری پلاننگ کو ٹھکرا کر اپنی پلاننگ سے کام کیا تھا۔"

جناب علی نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ محض ساجد کو ذلیل کرنے کے لئے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں؟"

آفیسر قہقہہ لگانے لگا۔ چودھری نے مسکرا کر کہا۔

"جناب علی تم بھی کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ کوئی کام معاوضہ ادا کئے بغیر نہیں ہوتا۔ میں آفیسر کو ڈھائی ہزار روپے دے رہا ہوں۔ باقی ڈھائی ہزار تم دو گے ـــــ پانچ ہزار میں یہ معاملہ طے ہو چکا ہے۔"

"یہ تو بہت ہیں ——— !" جناب علی نے کہا۔

"ہر سال ان باغات سے ساڑھے ستر ہزار کماتے ہو۔" آفیسر بولا۔ "اور مجھے پانچ ہزار دینے کے لئے جان نکل رہی ہے ——— بھئی اچھی طرح سوچ لو۔ پھر میں اس کام میں ہاتھ لگاؤں گا۔"

چودھری نے جلدی سے کہا۔

"ہم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے آپ بے فکر رہیں۔ آج رات کو روپے آپکے پہنچ جائیں گے۔ کیوں جناب علی؟"

"اُں ——— ہاں ٹھیک ہے۔"

آفیسر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور ایک بات یاد رکھو۔ سیلاب کے ڈر سے پنڈ چھوڑ کر نہ جانا اور نہ ہی اپنے بیوی بچوں کو کسی دوسری جگہ بھیجنا۔ ورنہ کیپٹن کو شبہ ہو جائے گا کہ اس تباہی میں تم لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" جناب علی نے کہا۔ "ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ زندگی گذارنے کی ہر چیز ہمارے پاس موجود ہو گی۔ پھر ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم خود پر الزام لینے کے لئے کہیں جائیں۔"

وہ سب واپسی کے لئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چودھری نے پوچھا۔

"یہ کام کب تک ہو گا ———؟"

"کل ——— پرسوں ——— کسی دن بھی ہو جائے گا۔" آفیسر نے کہا۔ "تم لوگ آج ہی سے اس طرح احتیاطی تدبیریں کرو کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو سکے ———"

"اچھی بات ہے ———"

وہ سب اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ آفیسر واپس گھوم کر نقشہ کے پاس آیا۔ اس نے اس حصہ کو دیکھا جہاں بند باندھا جا رہا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کیپٹن ساجد ——— !" پھر اس نے جلتا ہوا سگریٹ دریا کے بند پر رکھ کر مسل دیا۔

ریشماں کو یہ سنہرا موقعہ ہاتھ آیا تھا
پچھلی تمام ناکامیوں نے اسے سکھا دیا تھا
کہ اس کا باپ اسی طرح ارادے بدلتا رہیگا
اور وہ کبھی ایمانداری سے سہاگن نہ بن سکیگی،

جناب علی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا عادی تھا وہ جہاں اپنا نقصان دیکھتا فوراً ہی پینترا بدل کر کسی دوسرے فائدے کی طرف چھلانگ لگا دیتا تھا۔

اس کی ان عادتوں کی وجہ سے ریشماں کھلونہ بن کر رہ گئی تھی جناب علی نے پہلے حمیدے سے وعدہ کیا تھا کہ ریشماں کی شادی اس سے ہو گی۔ پھر حمیدے سے زیادہ تھانیدار اسے کارآمد نظر آیا۔ کچھ عرصہ تک وہ تھانیدار کو اپنے وعدہ سے بہلاتا رہا۔ پھر پٹواری نے اسے یقین دلایا کہ دریا کے کنارے والی زمین جو متنازعہ میں پھنسی ہوئی ہے وہ ریشماں کے عوض اسے واپس مل جائے گی ——— ساجد کے وہاں پہنچنے تک وہ پٹواری کی طرف جھکا رہا۔ پھر ساجد کا پلہ بھاری ہو

گیا ــــــ اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے داماد بنائے گا۔ مگر پولیٹیکل آئیز کی سازش سے پتہ چل رہا تھا کہ ساجد کا بُرا وقت آرہا ہے۔

اگر وہ ساجد کو اس بڑے وقت سے بچاتا تو اس کے باغات سیلاب کی نذر ہو جاتے اور یہ بہت بڑا نقصان تھا جسے وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ برسوں کی محنت سے یہ باغات حاصل ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ساجد کی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے جیسے کتنے ہی داماد اُسے مل سکتے تھے۔

پٹواری کا خیال بھی اس نے ترک کر دیا تھا۔ پنڈ کی طرف سیلاب آنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ دریا کے کنارے والی زمین بھی بہہ جاتی۔ سیلاب کے دَوران بہت سے دریا اپنا رُخ بدل دیتے ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ اَب وہ دریا ہمیشہ اس کی زمین پر سے ہی گزرتا رہے ــــــ لہٰذا پٹواری کی اہمیت بھی ختم ہو گئی تھی۔

آخر بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کے بعد اس نے ریشماں کی ماں سے کہا۔

"کل صبح ساجد اور شادو کا نکاح ہو جائے تو بہتر ہے۔"

ریشماں کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیوں ــــــ؟"

"بس یونہی ــــــ میں اُسے اپنی ریشماں کے قابل نہیں سمجھتا..."

"تو کیا وہ بوڑھا اس کے قابل ہے؟" وہ جل کر بولی۔

"نہیں ــــــ پٹواری سے بھی اس کی شادی نہیں ہو گی۔"

وہ سر پہ ہاتھ مار کر بولی۔

"ہائے اللہ ــــــ یہ تم اپنی بیٹی کو تماشہ کیوں بنا رہے ہو؟"

"یہ ہماری بیٹی کی ساری زندگی کا معاملہ ہے ہمیں خوب سوچ سمجھ کر لڑکے کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

"شادی کی تیاری بھی ہو گئی۔ لڑکی کو مہندی بھی لگ گئی اور ابھی تک لڑکے کا انتخاب ہی ہو رہا ہے ــــــ میں کچھ نہیں جانتی اب شادی ہو گی تو ساجد سے ــــــ ریشماں بھی یہی چاہتی ہے۔"

جناب علی اپنی بیوی کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اب وہ صاف طور سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس پنڈ میں سیلاب آنے والا ہے۔ ساجد کو اِس تباہی کا ذمہ دار بنایا جائے گا۔ اس پر مقدمہ چلے گا۔ اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔ اور فوجی عہدہ گھٹا دیا جائے گا۔ اس پنڈ کے تمام لوگ اسے مجرم سمجھ کر اس سے نفرت کریں گے۔ اس بُری طرح ذلیل ہونے والے آدمی کو وہ اپنا داماد کیسے بنا سکتا تھا۔

جناب علی یہ تمام باتیں اپنی بیوی اور بیٹی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ ایک زبان سے دوسری زبان تک جا کر ہی رہتی ہے۔ اس لئے وہ اپنا جُرم چھپانے کے لئے اپنوں سے بھی اِس حقیقت

کو چھپا رہا تھا۔

آخر اس نے سوچا کہ رشیماں اور اس کی ماں ساجد کو پسند کر رہی ہیں، تو کرتی رہیں۔ اگر شادو سے رشتہ ٹوٹ بھی گیا تو ساجد اور رشیماں کی شادی اتنی جلدی نہیں ہو سکے گی۔ اسے دو چار دن ٹالا جا سکتا ہے۔ اس عرصہ میں سیلاب آجائے گا اور سیلاب کے ساتھ ہی ساجد کی شامت بھی آجائے گی۔

جناب علی نے بظاہر اپنی شکست ظاہر کرتے ہوتے کہا۔

"اچھی بات ہے اگر رشیماں بھی اسے پسند کرتی ہے تو مجھے انکار نہیں ہے!"

رشیماں کی ماں خوش ہو گئی۔

رات کے دس بجے ساجد حویلی میں آیا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ دسترخوان پر ساجد، جناب علی، اسکی بیوی اور مائی خیراں کھانے کے لئے بیٹھیں۔ شادو اور رشیماں کھانے کی چیزیں لا کر رکھنے لگیں۔

ساجد نے صرف ایک بار نظریں اٹھا کر رشیماں کو دیکھا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ویسے دل ہی دل میں وہ اس کے حسن سے متاثر ضرور ہوا ——— حسن عورت کا ہو یا ایک پھول کا ——— ہر انسان اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کوئی بار بار دیکھتا ہے۔ کوئی ایک بار دیکھتا ہے۔ ساجد نے بھی ایک ہی بار اس لئے دیکھا کہ شادو کی محبت کے سامنے کسی کی خوبصورتی اسے دیوانہ نہیں بنا سکتی تھی۔

شادو چور نظروں سے کبھی ساجد کو دیکھ رہی تھی اور کبھی رشیماں کو ——— آخر عورت ہی تھی۔ دل میں یہ کھٹکا تھا کہ رشیماں کو دیکھ کر کہیں ساجد کی محبت ڈگمگا نہ جائے ——— اس کا دل اپنے محبوب کی طرف سے مطمئن ہو رہا تھا۔ مگر وہ رشیماں کی نگاہوں کو تاڑ گئی تھی۔ اور بڑی بے اطمینانی سے اور بڑی ناگواری سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رشیماں دنیا والوں سے بے نیاز ہو کر ساجد کو بار بار دیکھے جا رہی تھی۔ اور بڑھ بڑھ کر کھانے کی چیزیں پیش کر رہی تھی۔ اس کا ہر انداز بتا رہا تھا کہ وہ ساجد کو جیتنے کے لئے طرح طرح کے داؤ استعمال کر رہی ہے۔

وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ وہ حمیدے کو ہار چکی تھی ——— تھانیدار کو ہار چکی تھی ——— کہتے ہیں کہ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس لئے وہ بوڑھے پٹواری کو بھی قبول کر رہی تھی ——— وہ پٹواری بھی خواب ہو گیا لیکن ساجد کا خواب ایسا تھا کہ اس کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے ہر لڑکی جان کی بازی لگا دیتی ——— رشیماں کو بھی یہ سنہرا موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ پچھلی تمام ناکامیوں نے اسے سکھا دیا تھا کہ اس کا باپ اسی طرح ارادے بدلتا رہے گا اور وہ کبھی ایمانداری سے سہاگن نہ بن سکے گی۔

دنیا میں ہر چیز چرائی جا سکتی ہے۔ اس لئے وہ شادو کے سپنے چرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے جذبات کو اور اس کے تمام

ارمانوں کو سمیٹ کر حویلی میں اس طرح بند کر دینا چاہتی تھی جس طرح اس کا باپ کسانوں کی اگاہی ہوتی فصلوں کو سمیٹ کر اپنے گودام میں بند کر دیتا ہے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں لڑکیاں برتن اٹھا کر لے گئیں۔ رشیماں کی ماں نے بات چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ساجد بیٹے ——— ! شادی کی اتنی جلدی کیا ہے یہ زندگی کا بہت اہم مسئلہ ہے۔ دیکھو نا! رشیماں کے ابا ایک بوڑھے کے پلے اُسے باندھ رہے تھے میں نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ شادی نہیں ہو گی۔"

ساجد نے حیرانی سے پوچھا۔

"تو کیا برسوں بارات نہیں آتے گی؟"

"جب لڑکی راضی نہیں ہے تو بارات کس لئے آئے گی۔ تم ہی دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا میں رشیماں کی زندگی برباد کر دوں؟"

"نہیں، آپ کا فیصلہ بہت مناسب ہے۔ رشیماں اتنی اچھی لڑکی ہے کہ اس کا رشتہ بھی اتنے ہی اچھے لڑکے سے ہونا چاہیئے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔

"نہیں بیٹا ——— کوئی تمہارے ہی جیسا لڑکا ہو تو میں امیری غریبی نہیں دیکھوں گی۔ میں تو کہتی ہوں تم ہی کوئی فیصلہ کر دو۔"

ساجد نے چونک کر پوچھا۔

"کیسا فیصلہ ——— ؟"

ماں خیراں باتوں کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"رشیماں کی ماں ——— شادو اور ساجد کی بات پکی نہ ہوتی تو میں رشیماں کے بارے میں ضرور سوچتی ....."

"ماں ———!" ساجد نے کہا۔ "جب بات پکی ہو ہی چکی ہے تو اب تجھے رشیماں کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہیئے۔ اس میں شادو کی توہین ہے اور میں اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا ....."

یہ کہتے ہوتے وہ دسترخوان سے اٹھ گیا۔

جناب علی بھی دل ہی دل میں مسکراتے ہوتے اس کے ساتھ بیٹھک میں آ گیا۔

دوسری طرف شادو کچھ بے چین سی تھی۔ اسے ساجد پر اعتماد تھا۔ مگر رشیماں پر ذرا بھی بھروسہ نہ تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں کہ رشیماں کی نیت بدل گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد سرداراں، ساجد کو اس کا کمرہ دکھانے کے لئے آئی تو شادو کو دیکھ کر ساجد رُک گیا۔ سرداراں نے مسکرا کر کہا۔

"لے بیٹا! مجھ سے کیا شرم ——— باتیں کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ میں

دُھر کھڑی رہتی ہوں۔ کوئی آئے گا تو میں تمہیں خبر کر دوں گی۔"

وہ برآمدے کے دوسری طرف چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی شادو نے کہا۔

"ساجے ـــــ تم یہاں نہ رہو۔"

"کیوں ـــــ؟"

"بس یونہی ـــ؟"

"نہیں، کوئی تو بات ہو گی۔ جو تم مجھے یہاں رہنے سے منع کر رہی ہو"

وہ سر جھکا کر بولی۔

"بات کیا ہو گی۔ وہ رشیاں تمہیں گھور گھور کر دیکھتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔

"ہنستے کیا ہو؟ میرا بس چلے تو میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں۔"

اُس نے شادو کی تھوڑی پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کسی کی آنکھیں پھوڑنے کی بجائے اپنی محبت پر بھروسہ کرو۔ کیا تم مجھے اتنا کمزور سمجھتی ہے ـــــ؟"

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"نہیں ساجے ـــــ مجھے تم پر بڑا ناز ہے۔ جب سے تم آئے ہو میں اٹھا کر چلتی ہوں۔"

"تو پھر اطمینان رکھو۔ تمہارا سر کبھی نہیں جھکے گا۔"

"سر جھکے یا نہ جھکے۔ تم یہاں رہو گے تو میں بھی یہاں رہوں گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم سے دُور رکھنے کے لئے تو مجھے یہاں قید کیا جا رہا ہے۔ پھر تم یہاں کس طرح رہو گی۔؟"

شادو اس کے گریبان سے کھیلتی ہوئی بولی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تمہیں کسی کی نظر نہیں لگنے دوں گی۔ تم میرے ساتھ چلو یا پھر میں تمہارے قریب رہوں گی۔"

میں خود بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے اتنی جلدی نکاح کی ضد کی ہے۔ اب تمہاری یہ پیار بھری ضد میرے اندر ایک طوفان پیدا کر رہی ہے۔ تمہیں دیکھ کر جذبات ورغلاتے ہیں۔ کہ بہک جاؤ۔ اس لئے کہ انسان ازل سے شجر ممنوعہ کی طرف بہکتا رہا ہے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی سردار اں جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی ان کے پاس آئی اور بولی۔

"مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ کوئی آ گیا تو مفت کی بدنامی ہو گی ـــ شادو تم جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شادو نے جھکی جھکی خمار آلود نظروں سے اپنے محبوب کو دیکھا۔ وہ

بڑی محبت سے مسکرا رہا تھا۔ شادو شرماتی ہوئی وہاں سے گھوم کر چلی گئی۔

سرداراں نے کہا۔

"ساجے ـــــ میں تو تم لوگوں کی خوشی چاہتی ہوں۔ مگر یہاں کی عورتیں جاہل ہیں۔ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔"

وہ ساجد کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی

"آج شادو اس کمرے میں رہے گی۔"

"شادو یہاں رہے گی۔" ساجد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ـــــ!" وہ بڑی رازداری سے بولی۔ "کسی سے نہ کہنا کہ میں تمہیں بتایا ہے۔ جناب علی تمہاری ماں سے کہہ رہا تھا کہ اب اتنی رات کو واپس جاؤ۔ تمہاری شادی کے بارے میں بہت سی باتیں بھی کرنی ہیں۔ رشماں کی ماں شادو کو اس کمرے میں سونے کے لئے کہہ دیا ہے۔ اور وہ جو سامنے کمرہ ہے وہ تمہارے لئے ہے۔"

ساجد کے دل میں ایک عجیب سی گدگدی کا احساس ہونے لگا۔

بوڑھی سرداراں سب سمجھتی تھی کہ جوانی کس مقام پر آکر ٹھوکر کھاتی ہے ہولے سے بولی۔

"یہ لوگ تو بیکار پابندی لگاتے ہیں۔ صبح تمہارا نکاح ہونے ہی والا اگر دو گھڑی شادو سے مل لو گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

پھر وہ رازداری سے بولی۔

"میں جاتی ہوں۔ مگر دیکھو ابھی اس سے نہ ملنا۔ گھر والوں کو پہلے سو جانے دو ـــــ آں؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ساجد نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔ شادو کہیں نظر نہیں آئی ـــــ اگر کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ شادو اسے اتنی اچھی کیوں لگتی ہے؟ تو شاید وہ صحیح جواب نہ دے سکتا ـــــ کہہ دیتا کہ بس اچھی لگتی ہے رشماں سے تو کیا ساری دنیا سے اچھی لگتی ہے۔

شادو اگر رشماں کی طرح بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔ مگر قبول صورت تھی۔ ساجد کو گھر کی زینت بننے والی خوبصورتی کے مقابلہ میں وہ کسان لڑکی پسند تھی۔ جو کھیتوں میں کام کرتی تھی۔ جو محنتی اور بے باک تھی۔ اور سپاہی کی رائفل کی طرح کھیتوں اور میدانوں میں اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔

ساجد نے بڑی محبت سے اس کمرے کی طرف دیکھا۔ جہاں شادو رات گذارنے والی تھی۔ پھر وہ مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

بیٹھک میں جناب علی، مائی خیراں اور رشماں کی ماں باتیں کر رہے تھے سرداراں نے آکر کہا۔

"مائی خیراں ـــــ رات گذر جاتی ہے مگر شادی کی باتیں ختم نہیں ہوتیں

کل بیٹے کی شادی ہے آج تو تجھے نیند نہیں آئے گی۔"
ریشماں کی ماں نے کہا۔

"ہاں ——— ٹھیک تو ہے۔ ہم جاگ رہے ہیں۔ بیچاری شادو کیوں جاگے۔ اسے میرے کمرے میں سلا دو ——— مگر ——— نہیں ٹھہرو ——— میرے کمرے کے سامنے تو ساجد کا کمرہ ہے۔ تم ایسا کرو کہ شادو کو اوپر والے کمرے میں لیجاؤ۔ آج کی رات دلہن اپنے دولہے سے جتنی دُور رہے، اتنا ہی اچھا ہے۔"

اس بات پر سب ہی دل کھول کر قہقہے لگانے لگے۔

ریشماں کی ماں اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"مائی خیراں ——— میں شادو کے لئے کمرہ کھول کر ابھی آتی ہوں پھر ہم سب چل کر اسے مہندی لگائیں گے۔"

"ریشماں کہاں ہے؟" مائی خیراں نے پوچھا۔ "اسے بھی بُلا لینا۔"

"ریشماں تو کل رات سے نیند بھر کر سو نہ سکی۔ ابھی میرے کمرے میں سو رہی ہے۔ اُسے جگانا مناسب نہیں ہے۔"

ریشماں کی ماں یہ کہہ کر سرداراں کے ساتھ اوپری منزل کی طرف جانے لگی۔ زینے طے کر کے اوپر پہنچنے کے بعد اس نے سرداراں سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہو گیا ——— ؟"

"ہاں ———!"

"مگر سرداراں ———! ساجے تو شادو کا دیوانہ نظر آتا ہے۔ کھاتے وقت اُس نے ایک بار بھی ریشماں کی طرف نہیں دیکھا۔"

سرداراں مسکرا کر بولی۔

"تو بھی کیسی باتیں کرتی ہے۔ مرد بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ماں باپ کی نگاہیں بچا کر آنکھیں سینکتے ہیں۔ اری جو میں نے دیکھا ہے وہ تو نے نہیں دیکھا۔ سچ کہتی ہوں کہ ریشماں جب ساجے کے قریب جاتی تھی تو ساجے کے ہاتھ میں نوالہ کانپنے لگتا تھا۔"

"اچھا ———!" وہ خوش ہو گئی۔ "اللہ کرے کہ اس کے دل سے شادو کا خیال نکل جائے۔"

"بس نکل گیا سمجھو ———!" سرداراں رازداری سے بولی۔ "ایک بار وہ اکیلے میں ریشماں سے ملے گا تو اسی کا دیوانہ ہو کر رہ جائے گا۔"

"کہیں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔" ریشماں کی ماں ذرا پریشان ہو کر بولی۔ "جوان لڑکے اور لڑکی کا تنہائی میں ملنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"یہ لو ——— کیا تنہائی میں وہ ریشماں کو کھا جائے گا ———؟" سرداراں نے کہا۔

"ہماری ریشماں ایسی نہیں ہے اسے اپنی انگلی پکڑنے بھی نہیں دے گی ——— اگر ساجے کل ہی شادی کے لئے نہ مچلتا تو ہم ریشماں کو کبھی اس طرح اس سے ملنے

نہ دیتے ـــــ آہستہ آہستہ ہم خود ہی ساجے کو اپنی طرف جھکا لیتے ـــ مگر یہ وقت ایسا ہے کہ جو فیصلہ ہو وہ آج ہی کی رات ہو ـــــ تو ریشماں کی فکر نہ کر ـــــ وہ ساجے کو نگنی کا ناچ نچا کر رکھ دے گی۔"

ریشماں کی ماں کسی قدر مطمئن ہو کر بولی۔

"اچھی بات ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ کسی طرح وہ سہاگن بن جائے شادی کی اتنی تیاریاں ہونے کے بعد بھی وہ سہاگن نہ بنی تو بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔ ریشماں کے باپ کو تو اپنی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔"

"تو اطمینان رکھ ـــــ ریشماں کے نصیب ضرور جاگیں گے۔" سرداراں بولی۔ "اچھا ـــــ اب میں جاؤں گی۔ رات بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ میرا انعام مجھے دے دے۔"

"واہ ـــــ ابھی کام نہیں ہوا اور انعام مانگ رہی ہے۔"

"کام تو ہو گیا سمجھ ـــــ میں کہتی ہوں ریشماں کی ماں۔ مجھے سو روپے کی سخت ضرورت ہے اگر تیرا کام نہ بنا تو مجھے سو جوتے مار کر پیسے واپس لے لینا۔"

ریشماں کی ماں نے انکار کرنا چاہا۔ سرداراں اس کا ہاتھ پکڑ کر غصّے سے بولی۔

"انکار کرنے سے پہلے میری پچھلی خدمات کو یاد کر لے۔ میں تو ہمیشہ تیرے قدموں میں رہتی ہوں۔ بھلا یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی ـــــ؟"

ریشماں کی ماں نے اپنی کمر سے ..... دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی میں آدھے پیسے دوں گی۔ باقی پچاس روپے کام ہونے کے بعد لے جانا ـــــ بول منظور ہے کہ نہیں؟"

"اچھی بات ہے۔" وہ روپے لے کر اپنے گریبان میں چھپاتی ہوئی بولی۔ "میں یہ روپے اپنے بیٹے کو دے کر آتی ہوں اسے یہ بھی بتا دوں کہ آج رات مجھے حویلی میں رہنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ زینے طے کرتی ہوئی بیٹھک میں آئی۔ اس نے جناب علی سے بھی یہی کہا کہ ابھی بیٹے سے مل کر آتی ہوں ـــــ حویلی سے باہر آ کر اس نے جناب علی کو ایک موٹی سی گالی دی اور زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی جانے لگی۔

"حرامی کا بچہ ـــــ ایک دن تو نے میری بیٹی کی عزت لوٹی تھی۔ تو نے سمجھا تھا کہ میں غریب ہوں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گی ـــــ ہاں میں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ ایک سال گذر گیا ـــــ دو سال گذر گئے دس سال گذر گئے۔ اب تیری بھی بیٹی جوان ہو گئی ہے ـــــ آج تجھے معلوم ہو گا کہ سرداراں کتنی خاموشی سے تجھے ڈس کر چلی گئی ہے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے ایک چھوٹے سے کمرے کے چھوٹے سے مکان میں

آئی اور اپنے ضروری سامان کی گٹھری باندھنے لگی۔
آدھے گھنٹے بعد وہ ایک گٹھری سر پر اور ایک گٹھری بغل میں دبا کر
رات کی تاریکی میں اس پنڈ سے دور بہت دور ہوتی چلی گئی۔

اس کا سا جے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔
ایک کنواری محبوبہ کا غرور ٹوٹ رہا تھا۔
ایک غریب لڑکی کے نصیب دیکھتے ہی
دیکھتے سو گئے تھے۔ وہ چکرائی اور چکرا کر
فرش پر گر پڑی۔

کمرے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور ریشماں پلنگ پہ لیٹی ہوئی خاموشی سے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سُن رہی تھی۔

سرداراں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کمرے کی لالٹین کو بُجھا کر رکھے کیونکہ بعض اوقات تقدیر روشنی میں سوتی ہے اور اندھیرے میں جاگتی ہے۔

اور ریشماں اپنی سوتی ہوئی تقدیر کو ہر صورت سے جگانا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ اس مہربان اندھیرے میں جاگ رہی تھی۔ اور بڑی بےچینی

سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ ——— ساجد اس کی زندگی کا پہلا انتظار تھا۔ اس انتظار میں بےچینی تھی، رازداری تھی۔ اپنی کامیابی کا یقین بھی تھا۔ اور ناکامی کا خدشہ بھی ——— بدنام ہونے کا ڈر بھی تھا اور ساجد کے نام کے ساتھ اپنا نام چسپاں کرنے کی شدید آرزو بھی ——— کچھ بھی ہو۔ وُہ زندگی کی اس اہم بازی کو جیتنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ ایک ذرا سا کھلا۔ برآمدے میں جلنے والی لالٹین کی ہلکی سی روشنی کمرے میں جھانکنے لگی۔

دروازہ ذرا سا اور کھلا ——— پہلے ساجد کا سایہ رینگ کر اندر آیا پھر ساجد اندر آ کر کمرے کو دیکھنے لگا۔ دُور پلنگ پر وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

ساجد نے مسکراتے ہوئے اپنے پیچھے دروازے کو بند کر دیا۔

کمرہ پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

ریشماں اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی سانسوں پہ قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت تھوڑی دیر کیلئے رک گیا ہے ——— ساجد بھی کہیں رک گیا ہے شاید اندھیرے میں بھٹک بھٹک کر اپنی منزل کی طرف آ رہا تھا۔

پھر ریشماں کو اپنے قریب سرگوشی سنائی دی۔

"کیا سوگئی ہو۔ ۔ ۔ ؟"

وہ فوراً جواب نہ دے سکی —— اندر دل اور باہر جسم دھڑک رہا تھا۔

"اے ——!" ساجد نے اسے اندھیرے میں ٹٹولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ دل کے گنبد پہ پہنچ گیا۔ ریشماں نے گھبرا کر اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

"ہُم —— تو جاگ رہی ہو؟" آواز اور قریب آگئی۔

ریشماں کا ہاتھ بھٹکتا ہوا اس کے منہ کے قریب آگیا۔ ساجد نے اس ہاتھ کو چوم کر پوچھا۔

"میرے منہ پہ ہاتھ کیوں رکھ رہی ہو؟ کیا باتیں نہ کروں؟"

"نہیں ——!" وہ سرگوشی میں بولی۔

"شاید ڈرتی ہو کہ کوئی ہماری آواز سُن لے گا؟"

"ہاں ——!" وہ پھر سرگوشی میں بولی۔

وہ شادو کو آواز سے پہچان سکتا تھا۔ اس کے لہجے کو بھی کسی حد تک پہچان سکتا تھا۔ لیکن سرگوشی میں آواز اور لہجہ دونوں ہی بدل جاتے ہیں۔ اور پھر ایسی صورت میں جبکہ لہجہ جذبات کے تُند بہاؤ سے تھرّا رہا ہو تو اپنے اور پرائے کی پہچان نہیں ہوتی۔

ساجد نے شوخی سے پوچھا۔

"اچھا —— بات نہ کروں تو پھر کیا کروں؟"

دو مخملی باہیں اس کی گردن کے گرد ناگن کی طرح لپٹ گئیں۔

"شادو ہو یا ریشماں —— جسم تو ایک ہی جیسے تھے۔ عمر بھی ایک تھی، جذبات بھی ایک ہی جیسے تھے —— تاریکی میں چہرے تو نہیں دیکھے جاتے جو اپنائیت لیکر آئے اسے پرائی کیسے سمجھا جائے —— تاریخ بھی یہی کہتی ہے کہ بہادر اور جری سپاہی کو دشمن اپنا چہرہ دکھا کر کبھی نہیں مار سکتا —— ریشماں بھی شب خون مار رہی تھی۔

سپاہی اپنی محبوبہ کے پیار میں —— ساجد اپنی شادو کی محبت میں بہتا چلا گیا۔

پھر تقدیر نے اپنا ظالم فیصلہ سنا دیا۔ کمرے کے دوسری طرف کا دروازہ اچانک کھلا اور ریشماں کی ماں ہاتھ میں لالٹین لئے مائی نیراں سے باتیں کرتی ہوئی اندر آگئی۔

ایک لمحہ کے لئے سب ہی سکتے میں آگئے۔ ریشماں کی ماں کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ کر گر پڑی اور فرش پہ آتے ہی بھڑک کر بجھ گئی۔

اس ایک لمحہ کی روشنی میں ریشماں کی ماں اپنے سینے پر دو ہتھڑ مار کر چیخی۔

"ہائے نی میری بچّی لٹ گئی ——!"

اس ایک لمحہ کی بے رحم روشنی میں ساجد اپنی شادو کی بجائے ریشماں

کو دیکھ کر گھبرایا اور ایک زخمی کی طرح چیخا۔

"شادو ـــــ نہیں نہیں، ابھی شادو میرے پاس تھی ـــــ شادو!"

اس ایک لمحہ کی حقیقت افروز روشنی میں ریشماں دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ وہ اپنا تن من سب کچھ ہار کر ساجد کو جیت چکی تھی۔ مگر ساجد ہار کر بھی شادو کو پکار رہا تھا۔

مائی خیراں کے سینے سے ایک آہ نکلی وہ روتی ہوئی بولی۔

"ہائے ساجے ـــــ! یہ تو نے کیا کیا ـــــ میری شادو سے کس دشمنی کا بدلہ لیا ہے؟"

مائی خیراں بول رہی تھی۔ ریشماں کی ماں چیخ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ساری حویلی بیدار ہو گئی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ کسی کے ہاتھ میں لالٹین تھی کسی کے ہاتھ میں لاٹھی اور کسی کے ہاتھ میں رائفل ـــــ کمرے میں پہنچ کر پہلے تو سب ہی دم بخود رہ گئے۔ پھر ریشماں کی ماں کی فریادیں سن کر تمام باتیں سمجھ میں آ گئیں ـــــ ساجد اپنے جامے میں تھا۔ لیکن ریشماں اب تک ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔

جناب علی غصہ میں چیختا ہوا بیٹی کے پاس آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

"بے حیا ـــــ بے غیرت ـــــ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔۔۔"

ریشماں کی ماں اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔ ریشماں کے ماموں برکتے نے جلدی سے آگے بڑھ کر جناب علی کو اپنی گرفت میں لیا اور اسے ایک جھٹکے سے دور ہٹا کر کہا۔

"جب اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے تو پھر چور کو اپنے ہاں پناہ کیوں دی ـــــ مجرم ریشماں نہیں ساجے ہے۔۔۔۔"

سب کی نگاہیں ساجد کی طرف اٹھیں۔

"یہ جھوٹ ہے"، ساجد نے کہا۔ "مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ میں یہاں شادو سے ملنے آیا تھا۔"

"چپ بے شرم ـــــ!" مائی خیراں نے کہا۔ "ریشماں کو بدنام کر ہی دیا ہے اب شادو کو بھی بدنام کرنا چاہتا ہے۔ میں تیری زبان کھینچ لونگی۔"

"ماں ـــــ تو مجھے جان سے مار ڈال ـــــ پھر بھی میں سچ کہوں گا۔ سرداراں نے کہا تھا کہ آج شادو اس کمرے میں رہے گی۔"

"سرداراں ـــــ!" جناب علی لرز گیا۔ اچانک اسے سرداراں کی بیٹی یاد آ گئی ـــــ دس سال پہلے ٹھیک اسی طرح سرداراں ہاتھ میں لالٹین لئے اس کمرے میں آئی تھی۔ اس وقت جناب علی، ساجد کی جگہ کھڑا ہوا تھا اور بستر پر ریشماں کی بجائے سرداراں کی بیٹی منہ چھپائے پڑی تھی۔

جناب علی کے دل میں اچانک ایک اذیت ناک درد پیدا ہوا اور وہ سینہ تھام کر کرسی پر گر پڑا۔ ریشماں کی ماں دوڑ کر اپنے خاوند کے پاس آئی پھر اُسے سہارا دیتی ہوئی بولی۔

"ربا ـــــ ایسی بے عزّتی سے پہلے ہمیں موت آجاتی تو اچھا تھا ـــ کہاں ہے سرداراں ـــــ یہ اسی حرامزادی کی چالبازی ہے۔"

گھر کا ایک آدمی سرداراں کی تلاش میں چلا گیا۔ جناب علی بڑے کرب سے کراہتے ہوئے سوچنے لگا ـــــ وہ ناگن ڈس کر چلی گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میری دولت کے سامنے اسکی غریبی بے بس ہو گئی ہے ـــــ وہ دس سال تک خاموش رہی ـــــ بڑی وفاداری سے ہماری خدمت کرتی رہی ـــــ ہم پر اپنا اعتماد پختہ کرتی رہی ـــــ اور پھر ایک چیونٹی، جس طرح ہاتھی کو مار ڈالتی ہے، اسی طرح وہ مجھے بے موت مار گئی ـــــ آہ آج مجھے پتہ چلا کہ کمزور سے کمزور دشمن بھی کمزور نہیں ہوتا۔

ریشماں پلنگ پر منہ چھپائے رو رہی تھی۔

جناب علی نے گھبرا کر تمام مرد اور عورتوں کو دیکھا اور جلدی سے کہا۔

"یہاں سب اپنے گھر کے لوگ ہیں ـــــ اب اس سے پہلے کہ یہ بدنامی حویلی کے باہر جائے اس بات کو یہیں دفن کر دیا جائے۔"

برکتے نے بگڑ کر پوچھا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ ساجے کو آسانی سے چھوڑ دیا جائے گا؟"

سب لوگ جناب علی کو دیکھنے لگے۔ اسی وقت شادو بھی اوپر والے کمرے سے وہاں آگئی اور حیران نظروں سے اس بھیڑ کو دیکھنے لگی۔ اس کا دل شام ہی سے گھبرا رہا تھا۔ اس نے ساجے کو منع بھی کیا تھا کہ وہ یہاں نہ رہے ـــــ مگر اب وہ وقت گذر چکا تھا ـــــ اب اتنے لوگوں کے درمیان چادر میں لپٹی ہوئی ریشماں کو دیکھ کر اسے ایک نامعلوم خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

ریشماں کی ماں شادو کو دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھی اور بولی۔

"ساجے نے ہماری عزّت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اب وہ ریشماں کو بدنام ہونے کے لئے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا ـــــ بہتری اسی میں ہے کہ ریشماں سے اس کا نکاح پڑھا دیا جائے۔"

"ہاں یہی مناسب ہے۔" ایک نے کہا۔

"اس سے بہتر فیصلہ نہیں ہو سکتا۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

شادو گھبرا کر ایک ایک کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ساجد کو اپنی خاموش نظروں سے پکار رہی تھی۔ ساجد نے کہا۔

"میں ریشماں سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں ہے۔"

"کیسے منظور نہیں ہے؟" برکتے نے بگڑ کر کہا۔ "تم اگر بہت بڑے آفیسر ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے منہ پہ کالک پوت کر چلے جاؤ۔"

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔

"ساجے ـــــ ہم چاہتے ہیں کہ بات آگے نہ بڑھے۔ فیصلہ اسی کمرے میں ہو جائے۔ اگر تم شادی سے انکار کروگے تو پھر پنچوں کے سامنے فیصلہ ہوگا۔"

"نہیں۔ فیصلہ یہیں ہوگا۔" مائی خیراں نے کہا۔ "ساجے کا نکاح اب رشیماں سے ہوگا۔"

"نہیں ـــــ!" شادو کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس کا ساجے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ ایک کنواری محبوبہ کا غرور ٹوٹ چکا تھا۔ ایک غریب لڑکی کے نصیب دیکھتے ہی دیکھتے سو گئے تھے ـــــ وہ چکرائی اور چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

مائی خیراں رُکتی ہوئی اس پر جھک گئی۔

"شادو ـــــ!" ساجد دوڑ کر اس کے پاس آیا۔

مائی خیراں نے ہاتھ اٹھا کر ساجد کو کہا۔

"خبردار ـــــ اگر تو نے شادو کو ہاتھ بھی لگایا تو اچھا نہ ہوگا۔ میں تیری نہیں، اس بدنصیب بچی کی ماں ہوں۔ آج سے اس پنڈ کی تمام مائیں اپنی بیٹیوں کو تیرے سائے سے بچائیں گی۔"

ساجد کے دل کو چوٹ سی لگی۔ وہ بڑی حسرت سے شادو کو دیکھنے لگا۔ بیہوشی کی حالت میں شادو کا معصوم چہرہ اس کے دل کو تڑپا رہا تھا۔

وہ اس خوبصورت کنول کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے دلدل میں دھنس گیا تھا۔

مائی خیراں نے شادو کا سر اٹھا اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ساجے ـــــ! ایک ماں کی حیثیت سے میرا حکم ہے کہ اس حویلی کی بگڑی ہوئی عزت کو بنا دے۔ رشیماں سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لے۔۔۔"

"میں شادی نہیں کروں گا ـــــ!" وہ چیخ کر بولا۔

"نہیں کرے گا۔ تو میں تجھے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔ کسی کی عزت لوٹنے والا نہ تو ایک فرمانبردار بیٹا بن سکتا ہے اور نہ ہی ایک دیانت دار سپاہی ـــــ میں تجھ سے یہ نہیں پوچھتی کہ تو نے ایسی کمینگی کیوں کی ـــــ؟ لیکن جب کر ہی چکا ہے تو اسے شرافت سے نبھا دے۔۔۔۔۔"

شادو ذرا دیر کے لئے چکرائی تھی۔ ذرا دیر کے لئے ہوش سے بیگانہ ہوئی تھی۔ پھر وہ ہوش میں آ گئی۔ مگر تھوڑی دیر تک اسی طرح آنکھیں بند کئے مائی خیراں کے سینے سے لگی رہی۔ اسے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی ـــــ ذرا تسلی دینے، ذرا ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالنے کے لئے۔ ساجے نہ سہی ساجے کی ماں کی آغوش مل گئی تھی۔

پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا ـــــ سامنے ساجد کھڑا ہوا تھا یک بیک وہ رو دے لگی۔ ڈوپٹے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح سسکنے لگی اور

بلکنے لگی۔

ایک طرف رشماں منہ چھپا رہی تھی دوسری طرف شادو آنسو چھپا رہی تھی اور ان کے درمیان ساجد ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔۔۔ پھر شادو اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑتی ہوئی اور روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ مائی خیراں بھی اسے پکارتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگتی چلی گئی۔

ساجد تھوڑی دیر تک اس دروازے کو دیکھتا رہا جہاں سے شادو گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے رشماں کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس نے کہا۔

"جناب علی۔۔۔! میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو چکی ہے مگر نادانستگی میں۔۔۔ سرداراں نے مجھے دھوکہ دے کر اس کمرے میں آنے کے لئے اکسایا تھا۔ میں یہاں شادو کے لئے آیا تھا۔ میں نے اندھیرے میں رشماں کو نہیں پہچانا۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا رشماں نے بھی مجھے نہیں پہچانا تھا۔۔۔؟ ویسے پہچانا ہو یا نہ پہچانا ہو اس طرح لٹ جانے میں اس کی مرضی شامل تھی۔۔۔ اور اس حقیقت سے آپ لوگ انکار نہیں کر سکتے۔"

برکتے نے آگے بڑھ کر کہا۔

"انکار اور اقرار ہم نہیں جانتے۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ جس کی عزت سے کھیلے ہو اب اسے اپنی عزت بنا کر یہاں سے لے جاؤ۔"

"اونہہ۔۔۔!" ساجد نے نفرت سے کہا۔ "جس لڑکی کو اپنی عزت کا خیال نہ ہو اس کی عزت میں کیسے بنا سکتا ہوں۔ کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ زبردستی کی شادی سے اس لڑکی کی زندگی سنور جائے گی۔۔۔؟ میری خوشیاں اجاڑ کر، میری شادو کو مجھ سے چھین کر تم لوگ سکون سے رہ سکو گے۔۔۔؟ نہیں، کبھی نہیں۔۔۔ میں شادو کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہاں داماد بن کر رہ گیا تو اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا۔۔۔"

"تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔۔۔؟" اچانک ایک رائفل اس کی طرف اٹھ گئی۔ باقی لوگوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔

"ہم تمہیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دیں گے۔" برکتے نے کہا۔

ساجد نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"ہتھیاروں کے درمیاں کس طرح زندہ رہا جاتا ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کھلونوں کو اپنے ہی پاس رکھو۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا۔۔۔ تم لوگ نہیں سمجھنا چاہتے، نہ سہی۔۔۔ جاؤ، بلاؤ کسی قاضی کو۔۔۔ میں رشماں سے شادی کر دوں گا۔"

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔!" جناب علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ شادی نہیں، بربادی ہو گی۔۔۔ میں اپنی بیٹی کا رشتہ سلجے کو نہیں دوں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" رشماں کی ماں نے بگڑ کر پوچھا۔ "کیا بیٹی کی اس

بربادی کو سر جھکا کر برداشت کر لو گے ــــ ؟"

"تمہاری غیرت کہاں مر گئی ہے جناب علی !" برکتے نے پوچھا۔ "کیا ساجے کی دھمکی سے ڈر گئے ہو ــــ ؟"

"نہیں ــــ !" جناب علی نے کہا۔ "میں ڈرتا نہیں، انصاف کرنا چاہتا ہوں ــــ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے اس میں ریشماں کی بھی غلطی ہے۔ ساجے کی بھی غلطی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب سرداراں کی سازش سے ہوا ہے۔"

"جو کچھ بھی ہوا ہے۔ ہم سب کے حق میں بُرا ہوا ہے۔" ریشماں کی ماں نے کہا۔

"ساجے ــــ تم صرف میری بیٹی کو بُرا نہ کہو۔ اگر تم شادو سے ملنے بھی آئے تھے تو یہ بھی بُرائی تھی ــــ کیا نہیں تھی ؟"

"ہاں ــــ !" ساجد نے سر جھکا کر کہا۔ "اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ نکاح سے پہلے شادو سے ملنا بھی ایک بُرائی ہوتی۔"

ریشماں کی ماں بولی۔

"تو پھر اس بُرائی کی سزا صرف میری بیٹی کو کیوں مل رہی ہے ؟۔ میں تمہارے سامنے جھولی پھیلا کر عزّت کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ جو عزّت تم نے لی ہے۔ اسے واپس کر دو۔ واپس نہیں کر سکتے تو اپنی ماں کا حکم مان کر اپنی غلطی کو شرافت سے نبھا دو۔"

ساجد اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بعد الجھن میں پڑ گیا۔ شرافت کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم کر لے ــــ ریشماں کی ماں نے کہا۔

"ساجے ــــ سپاہی اپنے ملک کی بہو بیٹیوں کی عزّت کے محافظ ہوتے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اس عزّت کو اپنی حفاظت میں لینا نہیں چاہتے جو تمہارے ہاتھوں لُٹ چکی ہے۔"

ساجد نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ ریشماں کی ماں نے ترکش کا آخری تیر پھینکا۔

"ساجے ــــ تم کسی کی عزّت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ میری صرف ایک بات مان لو ــــ جاؤ اور سپاہی کی وردی جلا ڈالو۔ تمہارا وجود اس وردی کے لئے ایک گالی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں ــــ !" ساجد نے تڑپ کر کہا۔ "میں اپنی دھمکی واپس لیتا ہوں۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے ــــ میں ــــ میں اپنا دل جلا سکتا ہوں، وردی نہیں جلا سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر گر پڑا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"شادو ــــ مجھے معاف کر دو ــــ ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اپنی غلطی کی تلافی کروں۔ میں محبوب بنکر تمہیں جیت نہ سکا۔ مگر سپاہی بنکر ایک لڑکی کو بدنامی سے بچا سکتا ہوں ــــ مجھے معاف کر دو شادو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تمام لوگ خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے سب کے سب مطمئن ہو گئے تھے کہ رشیماں کے حق میں فیصلہ ہو گیا ہے لیکن جناب علی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی وقت بھی سیلاب یہاں آسکتا ہے۔ اور اس تباہی کے الزام میں جد گرفتار ہو سکتا ہے ـــــ وہ ایک تباہ ہونیوالے شخص کے ہاتھوں میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

"مجھے خوشی ہے کہ ساجد ہماری عزت کو اپنی عزت سمجھ کر اپنانا چاہتا ہے اب اس نیک کام میں ہم دیر نہیں کریں گے۔ پرسوں ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائیگا۔"

رشیماں کی ماں پریشاں ہو کر بولی۔

"پرسوں کیوں ـــــ نکاح تو کل صبح ہونا چاہئے۔"

"ہاں ـــــ!" ایک بڑھیا نے کہا۔ "یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

جناب علی نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"تم لوگ ذرا عقل سے بات کیا کرو۔ پہلے پٹواری کے ہاں خبر بھیجنا ہوگی۔ کہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ اسے نہیں دیں گے۔ شادی کا معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ اس معاملہ کو ختم کئے بغیر ابھی ساجے سے نکاح پڑھانا مناسب

نہیں ہے۔"

"سب مناسب ہے ـــــ!" رشیماں کی ماں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "پٹواری کے رشتے سے ایک نہیں سو بار انکار ہے۔ وہ ہمیں جان سے تو نہیں مارے گا۔ اور نہ ہی زبردستی رشیماں کو لیجانے کے لئے بارات لیکر آئے گا ـــــ اب میں تمہاری کسی بات میں نہیں آؤں گی۔ کل صبح نکاح ہوگا۔ اور ضرور ہوگا۔"

"ہاں ـــــ باجی ٹھیک کہتی ہیں۔" برکتے نے کہا۔ "کل صبح یہ نکاح ضرور ہوگا۔ میں پٹواری کے پاس جا کر اس کی ایسی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔"

بوڑھی عورت نے کہا۔

"جناب علی تیرا انکار نہیں چلے گا۔ سب کے فیصلے کے سامنے تجھے بھی سر جھکانا ہوگا ـــــ بول کیا کہتا ہے؟"

جناب علی خاموشی سے اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ پھر اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اچھا ـــــ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ مجھے منظور ہے۔"

ساجد کے سینے میں سانسیں یوں اٹکنے لگیں۔ جیسے وہ پھانسی پر لٹک رہا ہو ـــــ تقدیر کتنی بیدردی سے شادو کو چھین کر اس سے دور لے گئی تھی۔

میرے لئے سب ہی دیوانہ وار جان
دینے کیلئے تیار رہتے ہیں مگر آج پتہ چلا کہ
جان دینے اور دل دینے میں بہت فرق ہے
پہلے دل دیا جاتا ہے پھر جان دی جاتی ہے
اور ساجے کا دل تو وہ میری سوکن لے گئی ہے

ساجد اور ریشماں کا نکاح ہو گیا۔

مائی خیراں تھوڑی دیر کے لئے ماں کا فرض ادا کرنے آئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اُسے کہا کہ بیٹے اور بہو کو گھر لے جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

"جب تک شادو کہیں بیاہ کر نہیں جائے گی اس وقت تک ساجے میرے گھر کی دہلیز پہ قدم بھی نہیں رکھ سکے گا۔"

یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔

ساجد نے ماں سے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی اپنے گھر کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں جاتا تو شادو سے کس طرح سامنا کرتا۔ اُسے روتے اور

بلکتے ہوئے کیسے دیکھتا۔ اسے احساس تھا کہ اس لڑکی پہ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے۔ اور ظلم بھی اس نے کیا جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔

ساجد ندامت سے مرا جا رہا تھا۔ اس نے جناب علی سے کہا۔

"میرے گھر سے میرا سامان منگوا دو۔ کل میں ریشماں کو لیکر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"اتنی جلدی ——— ؟" جناب علی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ——— !"

ریشماں کی ماں نے کہا۔

"بیٹا ——— ایسی بھی جلدی کیا ہے۔ کچھ روز ہمارے ہاں رہو۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے۔"

"نہیں ماں جی ——— ! وہاں جاکر ریشماں کو ایک نئے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں۔ آپ ابھی نہ روکیں ویسے آپ جب بھی بلائیں گے میں آپ کی بیٹی کو یہاں بھیج دونگا۔"

ریشماں کی ماں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ساجد اس پنڈ میں شادو کے قریب نہ رہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھی بات ہے بیٹا ——— ! جیسے تمہاری مرضی۔ میں ریشماں کی رخصتی کا انتظام کرتی ہوں . . . !"

اُن سے باتیں کرنے کے بعد ساجد دریا پہ کام کرنے چلا گیا جناب علی اور گھر کے دوسرے لوگوں نے اُسے آج کام کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ اپنی ضد کا پکا تھا۔

"سات گھنٹے ڈیوٹی دینے سے شادی کی خوشیوں میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میں شام کو واپس آجاؤں گا۔"

سب اس کا منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ فرض کی ادائیگی کیلئے چلا گیا۔

پھر یہ خبر سارے پنڈ میں پھیل گئی کہ کل ساجد اپنی دلہن کو لے کر واپس جا رہا ہے۔

شادو کے سینے سے ایک آہ نکل کر رہ گئی۔ اب تو صرف وہ آہیں بھر سکتی تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ پچھلی رات سے آنکھیں روتے روتے سوج گئیں تھیں۔ اب تو آنسو بھی نہیں نکلتے تھے۔ مائی خیراں اور دینو چاچا اس کی آہ و زاری سنتے تھے اور سر جھکا کر بیٹی کی بدنصیبی کو کوس کر رہ جاتے تھے۔

اس کی زندگی میں کتنی مختصر سی خوشی آئی تھی۔

سارے ٹھیک ہی کہتا تھا کہ سپاہی گھر کی دہلیز سے باہر جاتے تو اس کی واپسی کی امید نہ رکھو ——— سب کچھ لٹ جانے کے بعد ایک امید رہ جاتی ہے۔ مگر جانے والا امید نہ رکھنے کا سبق سکھا گیا تھا۔

سچ تو ہے ——— اب میں کس بات کی امید رکھوں ——— ریشماں

سے اس کا نکاح ہو گیا کل وہ یہاں سے چلا جائے گا ـــــ پھر اُمید کس بات کی ـــــ؟ ہائے ساجے! ریشماں کی خوبصورتی تمہیں کھا گئی۔ مَیں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے کمزور ہو۔ محبت مجھ سے کرو گے اور راتیں سوکن کے ہاں گزارو گے۔

اَب مَیں گھر سے باہر کیسے نکلوں ـــــ؟

لڑکیاں مجھ سے ہنسیں گی۔

کوئی تمہاری بے وفائی کو نہیں سمجھے گی۔

بس یہی سمجھیں گی کہ مَیں تمہارے قابل نہیں تھی۔

تم نے ایک دن کے لئے عزت دی اور ساری زندگی کیلئے ذلیل اور رسوا کر دیا۔

عورتیں اپنی طنزیہ نگاہوں سے مجھے زخمی کریں گی۔

مَرد اپنی معنی خیز باتوں کا پتھر ماریں گے۔

اَب مَیں گھر سے کیسے نکلوں ـــــ؟

کہاں جاؤں ـــــ؟

گندم کا کھیت پوچھے گا کہ تیرا محبوب کہاں ہے؟

جب آسمان پہ کالے بادل آئیں گے تو بارش مجھ اکیلی کو بھگائیگا بھیگنے والا ساتھی میرے پاس نہیں ہوگا۔

میری ہتھیلی پر اب تک وہ بوسہ سُلگ رہا ہے۔

مَیں نے اس بوسے کو تیری ماں کی نظروں سے چھپایا اُسے دل سے لگایا۔

اسے کنوارے آنچل میں لپیٹا۔ سوتے وقت اس ہتھیلی کو سر کے نیچے رکھ کر اس بوسے کا سرہانہ بنایا ـــــ پیار کے اس ننھے سے لمحہ کو مَیں نے کتنے چاؤ سے سنبھال کر رکھا ہے۔ یہ تم نہیں جانتے ـــــ اور اب کبھی جان بھی نہ سکو گے کیونکہ تم پرائے ہو چکے ہو۔

آہ ـــــ یہ بوسہ ایک انگارے کی طرح ہتھیلی پر جل رہا ہے۔ مَیں اسے کیسے بجھاؤں؟

وہ اپنے رخسار کو ہتھیلی پر رکھ کر رونے لگی۔

ریشماں گھونگھٹ نکالے پھولوں کی سیج پر بیٹھی تھی۔

حالانکہ بستر باسی ہو چکا تھا۔ مگر پھولوں سے مہکانے کی کوشش کی گئی تھی دلہن کا جو سُرخ لباس تیار تھا۔ وہ اُسے پہنا دیا گیا تھا۔ اندر جو ایک پرانا پن پیدا

ہو گیا تھا اسے اُوپر سے بالکل نیا اور تازہ بنا دیا گیا تھا۔

اگر وہ کوئی غریب لڑکی ہوتی تو اب تک سارے پنڈ میں بدنامی ہو جاتی مگر اس کی بات حویلی سے باہر نہ جا سکی۔ جو بدنامی پھیل نہ سکے اسے بدنامی نہیں کہتے وہ ایک چھوٹا سا ناگوار حادثہ کہلاتی ہے اور ایسے حادثے بڑی جلدی بھلا دیتے جاتے ہیں۔

پنڈ کے لوگوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار نہیں کیا کہ ریشماں کی شادی پٹواری کی بجائے ساجے سے کیوں ہو گئی ہے؟ یہ ان کے لئے کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے حمیدے اور حمیدے کے بعد تھانیدار کی بارات آنے والی تھی۔ جیسے وہ باراتیں رُک گئیں، ویسے ہی پٹواری بھی رُک گیا ——— سب لوگ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ پنڈ کی یہ خوبصورت لڑکی ساجے کے نصیب میں تھی اس لئے اسے مل گئی۔

دراصل ساجے کو ریشماں نہیں ملی بلکہ ریشماں نے ساجے کو پا لیا تھا ساجے مطلوب تھا اور ریشماں اس کی طلبگار ——— وہ تمام دن اپنے کمرے میں رہی اور ساجے کا انتظار کرتی رہی۔ حالانکہ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے لئے دریا پر گیا ہے مگر اس کے ذہن میں دوسرے ہی سوالات اُبھر رہے تھے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اگر شادو سے نکاح ہوتا تو کیا ساجے اسے چھوڑ کر دریا کی طرف جاتا ——— ؟۔

شاید نہیں جاتا ——— وہ لڑکی بُری طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے ——— میں اس کی نظروں میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ حالانکہ مجھے ایک بار دیکھنے والے بار بار دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں میرے لئے رائفلیں چلتی ہیں، فسادات ہوتے ہیں میرے لئے سب ہی دیوانہ وار جان دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر شاید یہ بھلا کہ جان دینے اور دل دینے میں بہت فرق ہے پہلے دل دیا جاتا ہے۔ پھر جان دی جاتی ہے اور ساجے کا دل تو وہ میری سوکن لے گئی ہے۔ اسی لئے میرے اتنے قریب آنے پر بھی اس کی زبان پر شادو کا نام رہا . . . .

وہ رونے لگی۔ ساجے کو جیت کر بھی رونے لگی۔ رونا اس بات پر آیا کہ ساجے کو دیوانہ بنانے کا کوئی حربہ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ اب تک یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس میں کمی کس بات کی ہے وہ دولتمند ہے، جوان ہے خوبصورت ہے اور اپنی محبت اور اپنی تمام زندگی ساجے کے نام مخصوص کر رہی ہے۔ شادو جو کچھ ساجے کو دیتی اس سے زیادہ وہ دے رہی تھی ——— پھر کس بات کی کمی رہ جاتی ہے؟

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے وہ رو رہی تھی۔

رات کے نو بجے ایک عورت نے آکر بتایا کہ ساجے دریا سے واپس

آگیا ہے۔

وہ جلدی سے آنسو پونچھ کر اور گھونگھٹ نکال کر پھولوں کی ٹ
پہ بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ حویلی میں آکر بھی اتنی جلدی اس کمرے میں نہ
آئے گا! ابھی جناب علی کے ساتھ بیٹھ کر روٹیاں کھائے گا۔ باتیں کرے گا۔
کل یہاں سے واپس جانے کی تیاریاں کرے گا۔ تب کہیں اسے ریشماں کا
خیال آئے گا ـــــ جبراً حاصل کیا ہوا خاوند ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ
خوشیاں تو دے سکتا ہے۔ مگر محبت نہیں دے سکتا۔

ریشماں کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ
کھلا اور ساجد اس کی توقع کے خلاف سیدھا اسی کمرے میں آگیا۔

"ریشماں ـــــ!" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز ریشماں کے دل میں اترتی چلی گئی۔ پہلی بار اس نے اپ
زبان سے اس کا نام لیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر خوشی سے لہرا گئی۔

وہ قریب آکر بیٹھ گیا۔

"ماں جی کہہ رہی تھیں کہ تم نے صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے ـــــ کیو
ریشماں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر دل میں کہا۔

"تمہارے انتظار میں نہیں کھایا ـــــ مگر تمہیں اتنا بھی احساس نہ
رہا کہ کوئی تمہارے لئے بھوکی پیاسی بیٹھی ہو گی۔"

ساجد نے آہستگی سے کہا۔

"میں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

ریشماں نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے گھونگھٹ کی دیوار تھی۔ وہ
ساجد کو دیکھ نہ سکی۔ مگر اس کے دل کو دیکھ لیا۔ وہ تمام دن بھوکا رہ کر
سیدھا اس کے پاس آیا تھا اور اسے کھانے کے لئے پوچھ رہا تھا۔

کیا اسے محبت نہیں کہتے؟

ساجد نے اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اس
کا چہرہ سامنے آتے ہی وہ اسے محویت سے دیکھتا رہ گیا۔ پہلی بار اس
نے دسترخوان پر کھاتے وقت اسے ایک نظر دیکھا تھا اور دوسری بار کل رات
کو جب لالٹین فرش پر گرتے ہی بھڑک کر بجھنے لگی تو اس نے اس کی ایک جھلک
دیکھی تھی ـــــ وہ پہلا اور دوسرا جلوہ پرایا تھا اور ساجد اسے ایک اجنبی کی طرح
دیکھ کر نظرانداز کر گیا تھا۔ مگر اب وہ اسے اپنی دلہن کے روپ میں پوری
توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

وہ حقیقتاً قدرت کے ہاتھوں سے تراشا ہوا ایک حسین شاہکار تھی۔ ساجد
اگر شاعر ہوتا تو اس کے حسن و جمال کے متعلق بہت کچھ کہتا۔ اس نے صرف اتنا
ہی کہا۔

"تم سچ مچ بہت خوبصورت ہو ـــــ ریشماں تمہارے نصیب تو

کہیں بھی جاگ سکتے تھے۔ تم نے ـــــ میرے ساتھ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ یک بیک آگے کو جھکی اور اس کی گود میں مُنہ چھپا کر روتی ہوئی بولی۔

"مجھے معاف کر دو ساجے ـــــ مجھے معاف کر دو ـــــ مَیں مجبور تھی۔ مَیں نے بہت مجبور ہو کر ایسا کیا ہے . . . . . "

"مجبوری ـــــ تمہارے ساتھ کیا مجبوری ہو سکتی ہے؟ کیا تمہارے پاس دولت نہیں، عزت نہیں ہے، خوبصورتی نہیں ہے؟ تمہارے پاس وہ تمام چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر ہزاروں رشتے آتے ہیں۔"

"نہیں ساجے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ دولت ہے۔ مگر میرے ابا کی خودغرضی نے مجھے کنگال بنا رکھا ہے وہ اور زیادہ دولت حاصل کرنے کے لئے میرا ہاتھ کبھی اُس کے ہاتھ میں، کبھی اِس کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔ میں ایک تماشہ بنکر رہ گئی ہوں، اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔ مجھ سے اچھی تو غریب لڑکیاں ہیں، جن کی شادی کسی نہ کسی طرح دکھ مصیبت سے ہو جاتی ہے۔ مگر مَیں اپنے لئے یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ کبھی میری بھی شادی ہو سکے گی یا نہیں مَیں تو اب خوابوں میں بھی یہی دیکھنے لگی تھی کہ لوگ میرے لئے لاٹھیاں چلا رہے ہیں، خونریزی کر رہے ہیں۔ مَیں بوڑھی ہو چکی ہوں اور میرے ابا ابھی تک رشتہ لانے والوں کے سامنے مول تول کر رہے ہیں۔

مَیں بیان نہیں کر سکتی کہ میں کتنی پریشان ہو گئی تھی۔ کتنی مایوس ہو گئی

تھی۔ مائی سرداراں نے جب مجھے تم سے ملنے کے لئے کہا تو یک بیک میرے اندر انقلاب سا آگیا۔ دل نے کہا، یہی وقت ہے کہ مَیں اپنی تقدیر بدل سکتی ہوں۔ مجبوری نے سمجھایا کہ مَیں نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو زندگی بھر صرف میرے سپنوں میں شہنائیاں بجتی رہیں گی۔ مگر حقیقت میں کوئی دولہا میرے دروازے پر بارات لیکر نہیں آئے گا۔

مَیں نے آپ پر زیادتی کی ہے، مَیں نے بے حیائی کی ہے۔ عورت کی شرم کو داؤ پر لگا کر اپنی تقدیر سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ شریف لڑکیاں کبھی ایسی حرکتیں نہیں کرتیں۔ لیکن جو میری سمجھ میں آیا۔ وہ مَیں کر گذری۔ ایک مجرم کی طرح آپکے قدموں میں آگئی۔ آپ چاہیں مجھے ٹھوکر مار دیں یا گلے سے لگا لیں . . . . . "

ساجے نے بڑی اداسی سے کہا۔

"پہلے مَیں نے یہی کوشش کی تھی کہ تمہیں ٹھکرا دوں۔ لیکن مجھ سے بھی انجانے میں جو غلطی ہو گئی ہے اس کی سزا مجھے ملنی چاہیئے۔ دراصل ہم دونوں اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں۔ اٹھو! آنسو پونچھ لو۔ ہمیں عمر قید گذارنی ہے۔ آنسو زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔"

"تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟"

"نہیں معاف کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ محبت نہیں دے سکتا جو لٹ چکی ہے۔ لٹنے والے کے پاس رہ کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ساجے ـــــ محبت کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ تم مجھے موقعہ دو میں اس خزانے سے اپنے لئے محبت حاصل کر لوں گی۔"

"تمہارے لئے موقعہ ہی موقعہ ہے۔ اب تو میں ساری زندگی کے لئے تمہارا ہوں۔ ایک خاوند کی حیثیت سے میں بد دیانتی نہیں کروں گا۔ جو کچھ تمہیں دے سکتا ہوں، وہ ضرور دوں گا۔"

اس نے ریشماں کو اپنی گود سے اٹھایا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ ریشماں اس کی گردن میں باہیں ڈال کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

ساجے نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"سپاہی ایک زخم کھاتا ہے۔ ایک تمغہ حاصل کرتا ہے۔ میں نے دل پر ایک زخم کھایا ہے اور سینے پر تمہیں تمغہ کی طرح سجا لیا ہے۔"

پھر وہ اس تمغہ کو اپنی بدنصیبی کا انعام سمجھ کر چومنے لگا۔

کھل جا، میرے پانچ سو روپے!
کھل جا، میری زندگی بھر کے پیسے!
کھل جا، میری سہاگن تقدیر کھل جا!
تالا کھل گیا ۔ ۔ ۔ ۔

رات کے دو بجے تھے۔

نازو کے ماں باپ بوڑھے تھے۔ وہ تمام دن کھیتوں میں کام کرنے کے بعد گہری نیند میں ڈوبے ہوتے تھے۔ مگر نازو جاگ رہی تھی اور چارپائی پر لیٹی ہوئی اپنی اکیلی راتوں کا شمار کر رہی تھی۔ ماں باپ جاگتے رہتے تو شادی کی باتیں کرتے رہتے۔ اور جب وہ سو جاتے تو ان کی باتیں نازو کو جگاتی رہتیں اور اس جاگتی آنکھوں میں نئے نئے سپنے بنتی رہتیں۔ نہ جانے کس دنیا سے کوئی خوبرو نوجوان اس کے خیالات میں آجاتا اور ساری رات اس کے جذبات کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکاتا رہتا۔

بوڑھے ماں باپ نے برسوں کی محنت کے بعد پانچ سو روپے جمع کئے تھے۔ چار جوڑے ریشمی کپڑے اور ایک سونے کی انگوٹھی بنوا کر رکھی تھی۔ ایک ایک مٹھی اناج جمع کرتے کرتے ایک من گندم اور دس سیر مختلف قسم کی دالیں جمع ہو گئی تھیں۔ بیٹی کو دلہن بنانے کے لئے انہوں نے اپنے حوصلے سے زیادہ محنت کی تھی۔ مگر ابھی تک کہیں سے کوئی رشتہ نہیں آیا تھا ویسے امید تھی بلکہ یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے رشتے کی بات ضرور آئیگی۔

جب بیٹی جوان ہو، خوبصورت ہو، محنتی ہو۔ اس کی رخصتی کا تمام سامان موجود ہو۔ ہر طرف سے میٹھا س ہی میٹھا س ہو تو کہیں نہ کہیں سے کوئی مکھی اس میٹھا س پر بیٹھنے کے لئے ضرور آئے گی۔

اس چھوٹے سے مٹی کے گھر میں زندگی گذارنے کا بہت محدود سا سامان تھا۔ اس سامان میں ان کے باپ دادا کے زمانے کا ایک بہت بڑا صندوق بھی تھا۔ لکڑی کے اس صندوق میں وہ روزانہ تھوڑا تھوڑا گندم جمع کرتے رہتے تھے۔ اسی گندم کی تہہ میں انہوں نے پانچ سو روپے چھپا کر رکھ دیتے تھے کیونکہ جس گھر میں جوان بیٹی ہوتی ہے۔ اس گھر میں چوروں کی نظر سب سے پہلے جاتی ہے وہ جانتے ہیں کہ بیٹی کے جہیز کے لئے غریب سے غریب ماں باپ بھی کچھ نہ کچھ زیورات اور نقدی جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اسی لئے چوری صرف امیروں کے ہاں نہیں، غریبوں کے ہاں بھی ہوتی ہے۔ اور اسی ڈر سے نازو کے ماں باپ

نے سونے کی انگوٹھی اور پانچ سو روپے ایک کپڑے میں اچھی طرح لپیٹ کر صندوق کے اندر گندم کی تہہ میں رکھ دیئے تھے۔ چور سب کچھ لیکر بھاگ سکتے ہیں۔ لیکن من بھر اناج سر پر رکھ کر نہیں بھاگ سکتے اور پھر صندوق اتنا بڑا اور بھاری تھا۔ کہ اسے سر پر اٹھانے کے لئے چار ہٹے کٹے نوجوانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ بوڑھے اپنی جوان بیٹی کے مستقبل سے مطمئن ہو کر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رات کے دو بجے نازو نے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنیں۔ دُور اور نزدیک پنڈ کے سارے ہی کتے ایک ساتھ بھونک رہے تھے پھر آنگن میں جو مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ اس میں سے مرغیوں کے پھڑپھڑانے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نازو گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ آس پاس کے گھروں سے بچوں اور عورتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

"ابّا ــــــ!" وہ باپ کو آواز دیتی ہوئی چارپائی سے اتری۔ مگر زمین پر پاؤں رکھتے ہی گھبرا کر بولی۔

"ارے یہ کمرے میں پانی کہاں سے آگیا ــــــ؟ ابّا ــــــ ابّا ــــــ ماں جی . . . . . !"

ماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا نازو ــــــ؟"

"ماں جی ــــــ کمرے میں پانی بھر گیا ہے" وہ پانی میں چلتی ہوئی لالٹین کے پاس آئی۔

"ہائے ربّا ــــــ! ایسا لگتا ہے جیسے سیلاب آگیا ہے . . . . ."

اسی وقت باہر گلی سے کوئی چیختا ہوا بھاگنے لگا۔

"سیلاب آگیا ــــــ سیلاب آگیا ــــــ پنڈ والو ہوشیار ــــــ خبردار . . . . !"

نازو کی ماں نے اپنے خاوند کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"ارے اٹھو بھی ــــــ دیکھو کیا قیامت آگئی . . . . . ."

وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

"کیا ہوا ــــــ کیا ہو گیا نازو کی ماں ــــــ؟"

"گھر میں پانی بھر گیا ہے۔ ابھی کوئی چیخ رہا تھا کہ سیلاب آگیا ہے نمبردار کے گھر سے رونے پیٹنے کی آواز آرہی ہیں۔ اری نازو! وہ آٹے کا ٹین اور تیل کی بوتل اٹھالے ــــــ!"

وہ پانی میں دوڑتی ہوئی کپڑوں کی پیٹی کے پاس پہنچی اور اسے اٹھانے لگی۔

"اللہ اکبر ــــــ اللہ اکبر . . . . . !"

رات کے اندھیرے میں چاروں طرف سے اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔

نازو کا باپ چھلانگ لگا کر پانی میں آیا اور چیختے ہوئے بولا۔

"ہائے نازو کی ماں ـــــ میرے پانچ سو روپے ـــــ اناج کو بچاؤ۔ پہلے اناج کو بچاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نازو کپڑوں کی پیٹی سر پر رکھتی ہوئی بولی۔

"ابا ـــــ میں اسے چھت پر رکھ کر آتی ہوں ـــــ تم تھوڑا تھوڑا اناج ٹوکری میں رکھ کر دیتے جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں بیٹا ـــــ چھت پر نہ جانا ـــــ دیواریں کمزور ہیں ـــــ سامان تسکورے کے ہاں لیجاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نازو کی ماں سر پیٹتی ہوئی بولی۔

"میں پہلے ہی سمجھاتی تھی کہ دیواروں کو مضبوط کرو۔ اب تو یہ چھت بھی کسی وقت گر پڑے گی۔"

"بکواس نہ کر۔ گھر مضبوط کرنے میں پیسہ لگا دیتا تو نازو کے لئے روپے کیسے جمع کرتا ـــــ لا چابی دے۔ صندوق کھول کر پہلے اپنے روپے تو نکال لوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"چابی ـــــ!" وہ گھبرا کر بولی۔ "چابی کہاں رکھی ہے میں نے۔ شاید پیٹی میں ہے ـــــ ہاں پیٹی میں ہے۔"

"ارے کیا میری ساری رقم ڈبو دے گی۔ پیٹی تو نازو لے گئی ہے۔"

وہ نازو کو آوازیں دیتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ پانی پنڈلیوں تک آگیا تھا۔ باہر لوگ دوڑتے ہوئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ پانی میں گر رہے تھے۔ اور ڈبکی لگا لگا کر اٹھ رہے تھے۔ نازو بھی کسی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ اس کے سر پر رکھی ہوئی پیٹی الٹ کر پانی میں چلی گئی ـــــ ڈوبتے وقت پہلے اپنی فکر ہوتی ہے۔ نازو کچھ گھبرائی پھر ہاتھ پاؤں مار کر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

اس وقت باپ آوازیں دیتا ہوا قریب آگیا۔

"ابا ـــــ پیٹی پانی میں گر پڑی ہے ـــــ مجھے پکڑو ـــــ مجھے سنبھالو ابا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

باپ نے اسے سہارا دیا۔ پیٹی گرنے کے بعد کھل گئی تھی۔ اور دو چار کپڑے ادھر ادھر پانی میں تیر رہے تھے۔ بوڑھا باپ پانی میں ہاتھ مار کر پیٹی کو تلاش کرنے لگا۔ پیٹی ملی تو اس کے اندر چابی کو ڈھونڈنے لگا۔ اس وقت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ وہ چابی اہم تھی۔ اور وہی نہیں مل رہی تھی۔ پیٹی کا کونہ کونہ دیکھ لیا۔ لیکن وہ پانچ سو روپے کی کنجی نہ ملی ـــــ وہ پھر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ ٹھیک اسی وقت ایک زلزلہ سا محسوس ہوا ـــــ وہ زلزلہ نہیں تھا۔ مکان کی چھت اور دیواریں گر رہی تھیں۔

"ابا ـــــ!" نازو کی ماں کی ایک چیخ سنائی دی۔

پاس والے مکان سے آواز آئی۔

"ارے دوڑو ـــــ! نازو کا مکان گر پڑا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ماں جی ـــــ!" نازو چیختی ہوئی باپ کے ساتھ اس طرف بھاگی

پانی میں بھاگنا تو دور کی بات ہے، چلنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ اندھیرے میں کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں کہیں سے ٹارچ کی روشنی پڑی۔ نازو کی چیخ نکل گئی۔ سارا کا سارا مکان پانی میں بیٹھ گیا تھا۔

"نازو کی ماں ـــــ!" بوڑھا چیختا ہوا آگے بڑھا۔

پاس کھڑا ہوا ساجد ٹارچ کی روشنی پھینک رہا تھا۔ اس نے بوڑھے کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا اور چیخ کر بولا۔

"ٹھہر جاؤ ـــــ! مٹی کھود کر موسی کو نکالنا ہوگا ـــــ کسی سے پھاوڑا مانگ کر لاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بوڑھی عورت گری ہوئی چھت کے نیچے پانی میں زندہ دفن ہو گئی۔

"ماں جی ـــــ!" نازو کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ چکرا کر پانی میں گر پڑی۔

ساجے نے تیزی سے لپک کر اسے اٹھایا۔ ٹارچ اس کے باپ کے ہاتھ میں دی اور نازو کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر شکورے کی چھت

کی طرف لیجانے لگا۔

اندھیری رات میں قیامت کا شور برپا تھا کہیں کہیں پر لالٹین کی روشنی نظر آتی تھی۔ پانی کی لہروں میں اس کا عکس جھلملاتا تھا پھر بھاگتے ہوئے لوگوں کے ساتھ وہ روشنی بھی گم ہو جاتی تھی۔

پانی گھٹنوں سے اوپر پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے ہی بہت سے خاندان ریڑھے پر سامان لاد کر بنیڈ سے چلے گئے تھے جن کے پاس بچے اور سامان زیادہ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی دوڑ لگاتے ہوئے سیلاب کی زد سے دور ہونے کی کوشش کی تھی۔ جان بچا کر بھاگنے والے خیریت سے نکل بھی سکے تھے یا نہیں ـــ یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ سب ہی کو اپنی جان کی فکر لگی تھی۔

ساجد اور ننکورے نے گرے ہوئے مکان کے ملبے کو کھود کر نازو کی ماں کی لاش نکالی۔ لیکن یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اس لاش کو کہاں دفن کیا جائے؟ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ اسے پانی میں بہانا بھی مناسب نہ تھا۔ پتہ

نہیں وہ بہہ کر خشکی کے کون سے حصے میں پہنچتی اور گدھ، چیل اور کوؤں کی خوراک بن جاتی ـــــ آخر سوچ بچار کے بعد اسے دوبارہ مکان کے ملبے میں دفن کر دیا گیا۔

نازو کا باپ چپ چاپ ایک طرف کھڑا رہا۔ اب اسے بیوی کی موت سے زیادہ جوان بیٹی کی زندگی کا خیال تھا اور بیٹی کی زندگی اُن پانچ سو روپے سے سنور سکتی تھی۔ جو لکڑی کے صندوق میں دفن ہو گئے تھے۔

پھر وہ ساجد کے ہاتھ سے پھاوڑا لے کر بھاگتا ہوا صندوق کی طرف گیا۔

"میرے پیسے ـــــ میری زندگی بھر کی کمائی ڈوب رہی ہے۔ ارے کوئی میری مدد کرو۔ اس مٹی کو کھود کر صندوق کو کھولو۔ میری بیٹی کا جہیز ڈوب رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ چیختے ہوئے مٹی کھودنے لگا۔ ننکورے نے کہا۔

"معاف کرنا چاچا ـــــ میں نے یہاں بہت وقت لگا دیا مجھے اپنے گھر والوں کی بھی فکر ہے۔"

وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ ساجد نے بوڑھے کا ہاتھ بٹانا چاہا اسی وقت دور کہیں سے کسی عورت کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"ہائے میرا بچہ ـــــ میرا بچہ کہاں ہے ـــــ لے دیا ـــــ اے پتر ذرا میرے بچے کو ڈھونڈھ ـــــ ہائے میری گود ویران ہو رہی ہے۔۔۔"

ساجد دوڑتا ہوا پانی میں گرتا اور سنبھلتا ہوا اس عورت کی طرف چلا گیا۔
بوڑھے نے آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد صندوق کے اوپر سے مٹی
ہٹادی وہ صندوق آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اس کی کنڈی
اور تالا کبھی کبھی کسی لالٹین کی روشنی سے جھلک دکھا کر اندھیرے میں
چھپ جاتا تھا۔

چابی نہیں تھی وہ تالے کو توڑنے لگا۔ پھاوڑے کی پشت سے تالے
پر بھرپور ضربیں لگانے لگا ——— "کھل جا، میرے پانچ سو روپے ———
کھل جا، میری زندگی بھر کے پسینے ——— کھل جا، میری بیٹی کی سہاگ
تقدیر کھل جا ——— !"

تالا کھل گیا۔

اس نے کنڈی اٹھائی صندوق کا ڈھکنا بہت بھاری تھا۔ ایک
اس نے نازو کی ماں سے کہا تھا کہ "آ ——— ذرا ڈھکنا اٹھانے میں
مدد کر ——— !"

نازو کی ماں نے مسکرا کر طعنہ دیا تھا کہ "کیوں؟ بات کیا ہے؟ کیا
ہو گیا ہے؟"

عورت کا طعنہ مرد کو بھولی ہوئی جوانی کا حوصلہ دیتی ہے۔ نازو
باپ نے جوش میں آکر تنہا دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے آہستہ آہ

ڈھکنے کو اٹھا دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ تنہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ڈھکنے کو
اٹھانے کی کوشش کی ——— ہاتھوں میں مٹی لگنے کی وجہ سے ہاتھ پھسلنے لگے۔
اس نے ذرا سے اٹھے ہوئے ڈھکنے کو کاندھے پر رکھ لیا اور پوری قوت سے
کرتے ہوئے اٹھانے لگا۔

ڈھکنا اٹھنے لگا۔ اس نے ایک پاؤں صندوق کے اندر رکھ لیا اور
اسے پوری طرح کھولنے لگا ——— صندوق کے جوڑ میں سے پانی داخل
ہو گیا تھا۔ اور گندم کی ڈھیری سے اوپر چلا آیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ
روپے صندوق کے آخری کونے میں چھپے ہوتے ہیں ——— ڈھکنا جب
پوری طرح اٹھ گیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے گیلی گندم کو اٹھا اٹھا کر ایک
طرف پھینکنے لگا۔ گندم کے اس حصے کو کھودنے لگا۔ جہاں اس کی پونجی دفن
تھی۔

وہ مشین کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ تیزی سے گندم کو ادھر سے اُدھر پھینک
رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت کے ساتھ اٹھا ہوا ڈھکنا اپنے ڈھیلے قبضے کی
وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اور آگے پیچھے اس طرح ہل رہا تھا جیسے اب تب
میں گرنے ہی والا ہو۔

وہ روپے کے قریب پہنچنے کے لئے صندوق کی تہہ میں جھکتا جا رہا

تھا۔ کبھی اس کا سر صندوق کے پانی میں ڈوب جاتا اور کبھی ابھر جاتا تھا۔
آخر کار اس کے ہاتھ اس کپڑے تک پہنچ گئے۔ جس میں روپے اور سونے کی انگوٹھی تھی۔

اس نے کپڑے کو مٹھی میں دبوچ لیا۔ اسی وقت ڈھکنا اچانک ہی گرا۔ اور صندوق بند ہوگیا۔ اس کا ایک پاؤں باہر لٹک گیا تھا۔ اور بوڑھے پاؤں کی ہڈی اس وزنی ڈھکنے سے ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ تکلیف سے چیختے ہوئے اس نے کہیں ہاتھ جما کر اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے ہاتھ گندم کی ڈھیری میں دھنستے چلے گئے۔ وہ صندوق کے پانی میں ڈبکی کھانے لگا ——— اوپر وزنی ڈھکنا تھا نیچے گندم کی دلدل اور پانی تھا۔ ایک پاؤں باہر لٹک رہا تھا۔ باقی سارا جسم اندر تڑپ رہا تھا۔

وہ تڑپتا ہی رہ گیا۔ دُور دُور تک لوگوں کا شور تھا۔ لیکن کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ کوئی وہاں سے گذرتے ہوئے اندھیرے میں یہ نہ دیکھ سکا کہ ایک بوڑھا پاؤں بے رحم ہو کر صندوق کے باہر لٹک گیا ہے۔ اندر بوڑھی مٹھی ڈھیلی پڑ گئی ہے اور بیٹی کا سہاگ اپنے باپ کے ساتھ صندوق کی قبر میں دفن ہو گیا ہے۔

ہوا خاموش تھی۔ رات چیخ رہی تھی اور پانی لہرا لہرا کر انسان کے حوصلوں کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ساجد اس عورت کے ساتھ اس کے بچے کو ڈھونڈتا رہا۔ اس نے کئی غوطے لگائے لیکن بچہ نہ ملا ——— عورت سینہ پیٹ پیٹ کر بین کرنے لگی۔

ساجد دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا کر اپنے گھر کی طرف تیزی سے جانے لگا۔ وہ سب سے پہلے شادو اور اپنی ماں کی خبر لینے کے لئے حویلی سے نکلا تھا۔ لیکن دوسروں کی فریادیں سن کر وہ راستے ہی میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہی پاس والی چھت سے کرم دین اور اس کی بیوی کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اپنی جوان بیٹی کے لئے رو رہے تھے۔

"ہائے میری ناصرہ کہاں چلی گئی ——— مجھے چھوڑ دو ——— مجھے جانے دو ——— میں اپنی بیٹی کو تلاش کروں گا . . . . ."

دینو چاچا کی آواز آئی۔

"پاگل نہ بن کرم دین ——— تو اپاہج ہے۔ اس سیلاب میں نہ چل سکتا ہے، نہ تیر سکتا ہے گھبرا مت! تیری ناصرہ بچی نہیں ہے۔ وہ کسی کے ہاں پناہ لے چکی ہوگی . . . . ."

ساجد نے اپنے مکان میں داخل ہو کر ٹارچ کی روشنی کی ——— وہاں کوئی نہیں تھا۔ خالی مکان میں پانی تھل تھل کر رہا تھا اور دیواروں سے ٹکرا

رہا تھا۔

"ماں ـــــ!" وہ آوازیں دیتا ہوا آنگن میں آیا۔ پھر آنگن کی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آیا۔

"کون ہے ـــــ؟" دینو چاچا نے پلٹ کر پوچھا۔

ساجد نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں ـــــ!"

دینو چاچا اسے دیکھتے ہی دھپ سے چارپائی پر اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو۔ اسے اپنی جوان بیٹی کا روگ یاد آ گیا اور وہ روگ لگانے والا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ماں کہاں ہے ـــــ؟"

دینو چاچا اپنے صدمات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"وہ خیریت سے ہے۔"

ساجد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"اور ـــــ اور شادو ـــــ؟"

وہ یک بیک چارپائی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور گرج کر بولا۔

"خبردار ـــــ اپنی زبان سے شادو کا نام نہ لینا۔ میں نے پہلے ہی تیری ماں سے کہا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ وہ یہاں

رہے گی تو تو کسی نہ کسی بہانے سے یہاں ضرور آئے گا۔"

مجھے غلط نہ سمجھو چاچا!"

"جتنا تو نے اپنی ذلیل حرکتوں سے سمجھا دیا ہے۔ ہمارے لئے اتنا ہی سمجھنا بہت ہے اور زیادہ سمجھانے کی کوشش نہ کر۔۔۔۔۔"

ساجد بے بسی اور ندامت سے اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ پھر اس نے سر جھکا کر کہا۔

"تقدیر نے مجھے مجرم بنا دیا ہے۔ مگر چاچا ایک مجرم کو بھی اپنوں کی خیریت پوچھنے کا حق پہنچتا ہے۔"

"تیری ماں کی خیریت تجھے معلوم ہو چکی ہے۔ وہ اور شادو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیکار بیٹھنے والی عورتوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ اس سیلاب کے خطرے میں بھی دوسروں کے کام آنے کے لئے نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہیں ـــــ تو انکی فکر نہ کر ـــــ جا، حویلی میں جا کے عیش کر۔۔۔"

چاچا کا طعنہ سن کر وہ واپس جانے کے لئے تیزی سے پلٹ گیا اسی وقت مائی خیراں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی وہاں آ گئی۔

"کون ہے ـــــ؟"

"تیرا بیٹا ـــــ!" دینو چاچا نے کہا۔

"کیوں آیا ہے؟" وہ یک بیک بپھر کر بولی۔ "میں نے تجھ سے

کہہ دیا تھا کہ اس گھر کے دروازے پہ قدم نہ رکھنا ۔۔۔۔۔“

” ماں پہلے میری بات سُن لے ۔۔۔۔۔“

” میں کچھ نہیں سننا چاہتی ۔ ذلیل، کمینے یہاں تیری حویلی کی کوئی طوائف نہیں رہتی ہے ۔ کس کی تلاش میں آیا ہے یہاں ـــــ نکل جا ـــــ چل نکل یہاں سے ۔۔۔۔۔“

اس نے پاس رکھی ہوئی ایک لکڑی ہاتھ میں اٹھا لی ۔

دینو چاچا نے کہا ۔

” بھابھی ـــــ ! ساجے کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں آئے یہ تو میری بے غیرتی ہے کہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں سر چھپا رہا ہوں ۔“

” نہیں ـــــ ! “ مائی خیراں نے چیخ کر کہا ۔ ” یہ صرف میرا گھر ہے ۔ یہاں میری شادو رہے گی ۔ میں اس پہ ایسی ذلیل اولاد کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی ـــــ چل بھاگ جا یہاں سے ۔۔۔۔۔“

وہ غصہ میں اُسے مارنے لگی ۔ لکڑی ساجد کے ہاتھوں پہ پڑ رہی تھی ۔ سر پہ پڑ رہی تھی ۔

” جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جا ـــــ کسی بھی جوان بیٹی کی ماں تیری صورت دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی ۔۔۔۔۔“

وہ ماں کے ہاتھوں سے مار کھاتا ہوا زینے تک آیا ۔ پھر اس کے

قدم اندھیرے میں ڈگمگا گئے ۔ وہ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا ۔

ماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ۔ ہاتھ سے لکڑی چھوٹ کر گر پڑی دینو چاچا نے گھبرا کر پوچھا ۔

” اری بھابی ـــــ کیا ہوا ؟ کیا ساجے گر پڑا ہے ؟ “

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی ۔ اوپر سے پتھر نظر آنے والی ماں اندر سے ٹوٹ گئی تھی ۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ۔

پھر اندھیری سیڑھیوں کے نیچے سے ساجد کی کراہتی ہوئی آواز سُنائی دی ۔

” کیوں رو رہی ہے ماں ـــــ تو میرے دکھ کو سمجھے یا نہ سمجھے ۔ میں تیرے دکھ کو سمجھتا ہوں ـــــ تو ٹھیک کہتی ہے ۔ میں یہاں آؤں گا ۔ تو شادو مفت میں بدنام ہو گی ۔ میں ـــــ میں اب کبھی نہیں آؤں گا ۔۔۔“

ماں کے آنسو تھم گئے ۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ بیٹا خیریت سے ہے ۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی اپنی چارپائی پہ آ کر گر پڑی ۔

ساجد کے سر سے خون بہہ رہا تھا ۔ وہ اپنے قدموں سے پانی کو کاٹتا ہوا ـــــ ڈگمگاتا ہوا آنگن سے کمرے کے دروازے تک آیا ۔ خون اب پیشانی سے بہہ کر آنکھوں تک پہنچ رہا تھا ۔ وہ چوکھٹ سے

ٹیک لگا کر قمیض کے دامن سے خون پونچھنے لگا۔ پھر اس نے ٹارچ جلا کر اپنے خون کو دیکھا۔

شادو باہر سے آتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں ساجد کے خون سے بھیگے ہوئے دامن کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ ابھی وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو کر اپنے غموں کو بھلاتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔ یہاں اپنے سپاہی کو دیکھتے ہی وہ تڑپ کر رہ گئی۔ زخمی دل ساجے کے لئے پھڑپھڑانے لگا۔

ٹارچ بجھ گئی تھی۔ تاریکی گہری ہو گئی تھی۔ ساجے نے دور کھڑی ہوئی شادو کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھٹنے گھٹنے پانی میں پاؤں گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ آگے بیرونی دروازے کے قریب پہنچتے ہی ایک لرزتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

"ساجے ——— !"

وہ لڑکھڑا کر چوکھٹ سے لگ گیا۔

"تم ——— شا ——— شادو . . . . . !"

جواب میں شادو کی ہچکیاں سنائی دینے لگیں۔ یہ ہچکیاں، یہ آہیں، یہ آنسو سب کے سب ساجد کے دیئے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر بولا۔

"میں تمہارا مجرم ہوں شادو ——— کیا ——— کیا تم آنسو بہانے کی

بجائے مجھے کوئی سزا نہیں دے سکتیں؟"

"سزا دیکر سزا مانگ رہے ہو ——— ایسے کیوں بہلاتے ہو ساجے!، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور پیٹھ دکھانے والا سپاہی کبھی لوٹ کر نہیں آتا . . . . "

وہ رونے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ کو دبا کر اپنی آواز کو کچلنے لگی

"مجھے طعنے نہ دو شادو ——— میں پیٹھ دکھانے والا سپاہی نہیں ہوں۔ اندھیرے میں دشمن کی مکاری سے بڑے بڑے سورما مار کھا جاتے ہیں۔ میری شان یہی ہے کہ میں نے مات کھا کر بھی کسی کی عزت رکھ لی۔ مگر ——— تم میری سچائی کو نہیں سمجھ سکو گی۔ تمہارا دل مجھے بے وفا کہتا ہے اس لئے میں تمہیں بے وفا ہی نظر آؤں گا۔"

وہ سر جھکا کر جانے لگا۔

"ٹھہرو ———!" وہ سسکتی ہوئی بولی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب آ گئی۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ ایسی خاموشی جو "چپ" کی ہزار زبان سے دل کے بھید کھولتی ہے۔

پھر اتنی ہی خاموشی سے وہ اپنا آنچل لیکر اس کی پیشانی سے خون پونچھنے لگی۔ ساجد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اپنا آنچل میلا نہ کرو۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔"

وہ تھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"دلہن کا سُرخ جوڑا میں نے سپنوں میں دیکھا تھا رشماں نے وہ تمام سپنے چُرا لیے۔ تھوڑی سی سُرخی مجھے چُرا لینے دو۔ میں اسے بڑے جتن سے رکھوں گی . . . . "

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ ساجد برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جلدی سے رُخ پھیر لیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا سیلاب کی رُدوں کو کاٹتا ہوا اس سے دُور بہت دور جانے لگا۔

شادو نے چوکھٹ سے ٹیک لگا کر ایک سرد آہ بھری۔ پھر خون سے بھیگے ہوئے اس آنچل کو سینے سے لگا لیا۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ بگڑنے سے پہلے ہی اپنی تقدیر بنا لیتے ہیں۔

چوہدری فضل دین نے اپنی کوٹھی کی اوپری منزل میں ضروریاتِ زندگی

کا تمام سامان جمع کر لیا تھا۔ کھانے پکانے کا سامان۔ چولہا جلانے کی لکڑیاں، کراسن تیل، یہاں تک کہ پینے کا پانی بھی کئی ڈرم اور مٹکوں میں رکھ لیا گیا تھا۔

پچھلی رات سے تمام چیزیں اوپری منزل کے کمروں میں منتقل ہو رہی تھیں۔ چودھرائی اور اس کی جوان بیٹی رالو حیران تھیں کہ نیچے کا سامان اوپر کیوں سمیٹا جا رہا ہے ــــ؟ چودھری نے یہ کہہ کر ان کی تسلی کر دی تھی کہ بُرا وقت پوچھ کر نہیں آتا۔ نہ جانے کس وقت سیلاب آجائے۔ یہ پنڈ والے جو ساجے کی عقل سے کام لے کر بند باندھ رہے ہیں۔ وہ بند کمزور بھی ہو سکتا ہے۔ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور تباہی بھی لا سکتا ہے۔

چودھری کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ساجے کو بیوقوف سمجھتا ہے۔ مگر رالو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے کئی بار اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر ساجے کو باہر گلی سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بڑا اچھا لگا تھا ــــ اچھا اس لئے لگا تھا کہ اس کے آتے ہی حویلی کے سامنے ہونے والا ایک بہت بڑا فساد ختم ہو گیا تھا۔ اس کے آتے ہی پنڈ کے تمام لوگ جوش خروش سے بند باندھنے کا کام کر رہے تھے۔

ساجے کی صرف ایک بات اُسے بُری لگی تھی کہ اس نے شادو کو چھوڑ کر رشماں سے شادی کر لی تھی۔

اس نے ایسا کیوں کیا ــــ؟ یہ بات رالو کی سمجھ میں نہیں آتی۔

چودھری نے بڑی نفرت سے کہا۔

"ارے وہ تو ریشماں کی خوبصورتی اور جناب علی کی دولت دیکھ کر بک گیا ہے۔ بڑا آیا ہے فوجی افسر بنکر ـــــ دیکھ لینا یہاں سے ذلیل ہو کر جائے گا۔"

چودھرانی نے کہا۔

"مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔ شام کو ماتی خیراں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ صبح ساجے اور شادو کا نکاح ہوگا۔ ساجے ایک رات جناب علی کی حویلی میں رہے گا۔ اور صبح دولہا بنکر شادو کو بیاہنے آئے گا۔ مگر صبح ہونے ہی پتہ چلا کہ نکاح شادو سے نہیں ریشماں سے ہو رہا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک ہی رات میں اتنا بڑا فیصلہ بدل گیا۔ اس میں جناب علی کی کوئی گہری چال معلوم ہوتی ہے۔ وہ بڑا ہی مکار ہے۔"

چودھری فضل دین اپنی بیوی کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ ڈر رہا تھا۔ کہ جناب علی نے اپنی بیٹی ساجے کو کیوں دی۔ جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں سیلاب آئے گا۔ اور پولیٹیکل آفیسر ساجے کو مجرم ثابت کرکے اسے جیل کو گا ـــــ کیا کوئی باپ جیل میں جانے والے مجرم کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے سکتا ہے؟"

چودھری کی پریشانی زیادہ بڑھ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ جناب علی

دوہری چال چل رہا ہے۔ ایک طرف وہ پولیٹیکل آفیسر، تھانیدار اور چودھری کی سازش میں شریک ہو کر سیلاب لا رہا ہے۔ دوسری طرف ساجے کو بیٹی کا رشتہ دیکر ایک فوجی افسر کو اپنے اعتماد میں لے رہا ہے۔ تاکہ ان کی سازش اگر کسی وجہ سے ناکام ہو جائے تو ساجے اپنے سسر پہ شبہ نہ کر سکے۔ دنیا بھی یہی کہے گی کہ جناب علی کو اگر سازش ہی کرنی ہوتی تو وہ ساجے کو اپنا داماد کیوں بناتا.....

پریشانی اور گھبراہٹ کی وجہ سے چودھری کے پیٹ میں بات نہ رہ سکی۔ اس نے چودھرانی سے کہا۔

"جناب علی ہم سب کو پھانسنا چاہتا ہے۔"

"وہ کیسے ـــــ؟"

"اس پنڈ میں ہماری مرضی سے سیلاب آئے گا اور ضرور آئیگا۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" چودھرانی نے تعجب سے پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہیں راز کی بات بتاتا ہوں۔ تم کسی سے نہ کہنا۔"

"کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"رابو سے بھی نہ کہنا ـــــ! وہ نادان ہے ہو سکتا ہے کہ کسی کے سامنے اس کی زبان سے یہ بات نکل جائے۔"

"ٹھیک ہے رابو سے بھی نہیں کہوں گی۔"

راہو کھانے کے برتن لیکر کمرے کے پاس سے گذر رہی تھی۔ ماں باپ کو راز کی باتیں کرتے سُن کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اور بڑی حیرانی سے باپ کی باتیں سننے لگی۔

وہ باغات جن سے ہزاروں روپے کی آمدنی تھی۔ اسے سیلاب سے بچا جا رہا تھا ___ چودھرانی سن کر خوش ہو رہی تھی اور چودھری کی سوجھ بوجھ کی تعریفیں کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اپنے خاوند کی طرح سب سے پہلے دولت کو اہمیت دیتی تھی۔

رابعہ بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی کہ سیلاب آئے گا اور سینکڑوں گھروں کو اجاڑ دیگا ___ راہو کے خیالات اچھے تھے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی تھی مگر وہ عملی طور سے کمزور تھی۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہہ سکتی ___ اس نے سب کچھ سُنا اور سن کر خاموش رہ گئی۔

لیکن ایک بات ضرور تھی کہ اگر کہیں ساجے اسے مل جاتا ___ سپنوں ہی میں مل جاتا تو وہ اس کے خلاف ہونے والی سازش سے ضرور آگاہ کر دیتی۔ مگر وہ مجبور تھی کیونکہ اسے پردے میں رکھا جاتا تھا کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اتنی ذہین بھی نہیں تھی کسی چالاکی سے ساجے تک یہ بات پہنچا دیتی۔

وہ مایوس ہو کر رہ گئی۔

پھر تمام دن گذر گیا۔ اور رات آگئی۔

اس اندھی رات کے ساتھ اندھا سیلاب بھی آگیا۔

تمام پنڈ والے اسے قہرِ الٰہی سمجھ رہے تھے۔ لیکن راہو اسے قہرِ جاگیرداری سمجھ رہی تھی۔ انسان کو جب انسان کا ظلم سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اسے خدا کے نام سے منسوب کر کے صبر کر لیتا ہے۔

راہو سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ باہر ایسی قیامت کا شور تھا کہ کلیجہ کانپ کانپ جاتا تھا۔ اس کے چودھری باپ نے اُسے اور اس کی ماں کو سیلاب کی زد سے بچا لیا تھا۔ لیکن دوسروں کی مائیں اور بیٹیاں ڈوب رہی تھیں۔ اور چیخ چیخ کر اپنے بچھڑنے والوں کو پکار رہی تھیں۔ چودھری کے گوالے پچھلی رات ہی تمام مویشیوں کو ہانک کر کسی محفوظ علاقہ کی طرف لے گئے تھے۔ مگر پنڈ والوں کے مویشی بہہ کر کہیں سے کہیں چلے گئے تھے۔ وہ ہر طرف سے تباہ ہو رہے تھے۔ اور ایسے تباہ ہو رہے تھے کہ انسانی ہمدردی کے تحت ایک دوسرے کو تباہی سے بچا بھی نہیں سکتے تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں سب کو اپنی جان و مال کی فکر لگی ہوئی تھی۔

راہو اچانک اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ ساجے اس کے دل و دماغ پر

چھایا ہوا تھا. کوئی اس سے پوچھتا کہ بتاؤ کیا ساجد سے عشق ہوگیا ہے؟ ا
وہ جواب دیتی کہ —— عشق نہیں البتہ ایک لگاؤ ہوگیا ہے. کوئی اچھا
لگتا ہے اور بار بار خیالوں میں آجاتا ہے۔ اور اس کے لئے کچھ کر گزرنے
کو جی چاہتا ہے تو اس کر گزرنے کو کیا کہیں گے؟ —— جو کچھ بھی کہا
کے بہر حال وہ ساجد کی خاطر کمرے سے نکل آئی. اس نے سوچ لیا تھا
وہ کوٹھی کے بیرونی دروازے تک جائے گی. باہر لوگ اِدھر اُدھر بھاگ
رہے ہیں. ان میں اگر کوئی سہیلی نظر آگئی یا کوئی قابلِ اعتماد آدمی مل گ
تو وہ ساجد تک ضرور یہ اطلاع پہنچا دیگی کہ اس کے خلاف ساز
ہو رہی ہے۔

وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی دوسرے کمرے کے قریب آئی اور تاریکی
چھپ کر کمرے کے اندر دیکھنے لگی. اس کی ماں پلنگ پر آرام سے لیٹی ہوئی
اور چودھری قریب بیٹھا ہوا حقے کے کش لگا رہا تھا۔ وہ دونوں بڑے
اطمینان اور سکون سے باتیں کر رہے تھے. ان کی کوٹھی کے نچلے حصے میں پا
آگیا تھا. مگر وہ تباہی لانے والا پانی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ آئندہ
بھی تباہیوں سے نمٹنے کے لئے ہر طرح سے مضبوط اور مطمئن ہو کر بیٹھ گ
تھے. باہر کے بڑے دروازے کو انہوں نے اندر سے بند کر دیا تھا. تاکہ
آفت زدہ ان کے ہاں پناہ لینے نہ آجائے۔

رالو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے کے پاس آئی. چاروں طرف
ری تاریکی تھی. مگر وہ اس تاریکی میں بھی اپنے گھر کے ایک ایک کونے
پہنچ سکتی تھی. نیچے برآمدے میں گھٹنوں تک پانی تھا۔ پانی میں
رتے ہی خوف محسوس ہوا کہ کہیں سانپ یا کوئی زہریلا کیڑا نہ کاٹ لے۔
ہ بڑی ڈرپوک تھی. ماں باپ نے اپنی اس لاڈلی بیٹی کی پرورش اتنے
یار سے کی تھی کہ اس میں بلا کی نزاکت آگئی تھی. وہ اپنے والدین سے
انتہا محبت کرتی تھی لیکن لڑکیوں کی محبت جوانی میں ایک نیا راستہ
ش کر لیتی ہے. اور جب وہ راستہ مل جاتا ہے تو ماں باپ کی محبت کچھ پھیکی
جاتی ہے۔ —— رالو کے نئے راستے پر ساجد آگیا تھا. جب اس لڑکی
کی اور بدی کی بنیاد پر سوچا تو ماں باپ کی محبت ذرا پھیکی پڑ گئی۔
ائی پر انگڑائی لینے والی عمر نے یہی فیصلہ کیا کہ ساجد سے ضرور نیکی کرنی چاہیئے
ل کرنا سہی، چوری چھپے ہی سہی . . . .

وہ دھیرے دھیرے سنبھل کر چلتی ہوئی بیرونی دروازے تک آئی۔
روازے پر تالا پڑا ہوا تھا. چودھری بڑا محتاط تھا. وہ جانتا تھا کہ اس
یلاب سے فائدہ اٹھا کر چور بدمعاش ڈاکے بھی ڈال سکتے تھے اس لئے
نے باہر سے آنے والوں کے لئے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ اندر بھری
ئی رائفلیں ہر وقت تیار تھیں. چودھری نے اپنے جوان بیٹے حمیدے کو سمجھا

دیا تھا کہ کوٹھی کے اندر صرف باپ بیٹے اپنی رائفلوں کے ساتھ رہیں گے
کسی میرے محافظ کا یا ملازم کا اضافہ کرنے سے راشن میں کمی ہو جائے گی
نہ جانے یہ سیلاب کتنے دنوں تک رہتا۔ لہٰذا کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ
کر استعمال کرنا تھا۔

رابو دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس آئی اور اس کی چٹ
ہٹا کر اسے کھول دیا۔ باہر تاریکی میں گذرتے ہوئے لوگ سائے کی طرح
نظر آ رہے تھے۔ پانی میں "چھپاک، چھپاک" چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں
کسی کو پہچاننا بہت مشکل تھا۔

وہ کھڑکی کے باہر سر نکال کر دیکھنے لگی۔

کھڑکی کے بالکل قریب دو سائے دیوار سے چپکے ہوئے تھے
یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کھڑکی سے جھانکنے والی اکیلی ہے یا اس
ساتھ اور بھی کوئی ہے۔ رابو نے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

"کون ہے ——— ؟"

سائے اور قریب آ گئے۔ رابو نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن اسی وقت
ہاتھ اس کے پیچھے گردن پر آیا اور دوسرا ہاتھ اس کی منہ پر ———
پھر ایک سائے نے اسے کھڑکی سے باہر کھینچ لیا۔ دوسرے نے اس کی
میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیا ——— وہ تڑپنے لگی۔ مچلنے لگی۔ لیکن چیخ نہ

اس کے منہ پر اتنی سختی سے ہاتھ جما ہوا تھا۔ کہ اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔

پھر اس کے سر پر ایک زبردست چوٹ پڑی۔ آنکھوں کے سامنے
تارے ناچنے لگے۔ اور وہ بیہوش ہو کر ان کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ ایک
نے اسے کاندھے پر لادا۔ اور دوسرا اس کی راہنمائی کرتا ہوا محتاط انداز
میں آگے بڑھنے لگا۔

"چھپاک ——— چھپاک ———" پانی میں قدموں کی آوازیں دور
ہونے لگیں۔

"گڑگڑ ——— گڑگڑ ———" چودھری کا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔
چودھرائی مسکرا رہی تھی۔ وہ دونوں مسرور تھے۔ مطمئن تھے۔ اپنے گھر کی تمام
قیمتی چیزوں کو انہوں نے سیلاب میں بہنے سے بچا لیا تھا۔ مگر قدرت کسی کو معاف
نہیں کرتی ——— ان کی سب سے قیمتی چیز ——— ان کی بیٹی، ان کی عزت،
اس سیلاب میں ——— نہ معلوم کس قربان گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

حمید کو اپنے گھر کی فکر نہیں تھی۔ حالانکہ اس کے باپ نے اس سے کہا تھا کہ رات کو گھر سے باہر نہ رہے۔ کبھی وقت بھی سیلاب آسکتا ہے۔ لیکن وہ جان بوجھ کر اپنے گھر سے دور ہو گیا۔

وہ پنڈ سے باہر اپنے ایک پرانے مکان میں تھا۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا لیکن مضبوط تھا۔ اور سیلابی لہروں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ حمید نے پچھلی رات سے یہاں رہنے کے انتظامات کر رہا تھا۔ کھانے پینے کا تمام سامان، شراب کی بوتلیں، ٹرانسسٹر ریڈیو ——— عیش و عشرت کا ہر سامان وہاں پہنچ چکا تھا۔ اب اس تنہائی کو رنگین بنانے کے لئے صرف ریشماں کی کمی رہ گئی تھی۔

وہ ریشماں کو نہیں بھولا تھا۔ اور نہ ہی کبھی بھول سکتا تھا۔ ہارا ہوا جواری اپنی شکست کو کبھی نہیں بھولتا۔ ہارنے کے بعد جیتنے کی خواہش دیوانگی کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ تو ریشماں کا دیوانہ تھا۔ کئی بار اس نے کوشش کی تھی کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا ہے تو ٹیڑھی انگلی سے ہی نکال لے۔ ریشماں کو اغوا کر لے۔ اسے ایک بار زبردستی حاصل کر لے۔ پھر وہ خود ہی ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاتے گی۔ لیکن ابھی تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

جناب علی بڑا کائیاں تھا۔ وہ اپنی دولت، اپنی جائیداد اور اپنی خوبصورت بیٹی کی حفاظت کرنا جانتا تھا۔ اور اب تو ساجے بھی پنڈ کی اس حسین ترین

لڑکی کا مالک بنکر حویلی میں بیٹھ گیا تھا۔ اتنے زبردست پہرے سے ریشماں کو نکال کر لے آنا آسان کام نہیں تھا ——— لیکن دیوانگی کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ حمید سے آسانی سے ماننے والا نہیں تھا۔

اس نے اپنے ساتھ دو نوجوان اور صحتمند ملازم رکھے تھے جو اس کیلئے جان کی بازی لگا سکتے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ سب سے پہلے ساجد کو کسی طرح حویلی سے دور کر دیا جاتے۔ اگر وہ راستے سے ہٹ جاتے تو وہاں صرف جناب علی اور ریشماں کا ماموں بہ کتے رہ جائیں گے۔ اور ان دونوں سے حمید کے دو ملازم کسی طرح نمٹ سکتے تھے۔ انہیں زخمی کر کے یا ہلاک کر کے ——— جیسے بھی ہوتا وہ ریشماں کو اٹھا کر لے آتے۔

اس لئے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد حمید نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ پہلے شادو کو اٹھا لاؤ ——— شادو اگر غائب ہو گی تو ساجد حویلی چھوڑ کر ضرور اُس کی تلاش میں نکلے گا۔ ایک تیر سے دو شکار ہو سکتے تھے۔ جب تک ریشماں حاصل نہ ہوتی۔ اس وقت تک وہ شادو کی جوانی سے دل بہلاتا۔ ساجد نے اس کی ریشماں کو چھین لیا تھا۔ وہ ساجد کی شادو کو تباہ کر دیتا۔ پھر جب تک ساجد اپنی محبوبہ کو تلاش کرتا۔ تب تک اس کے ملازم ریشماں کو اٹھا کر لے آئے ——— انسان کے پاس دولت ہو تو سیلاب کی مصیبتیں بھی راحت بن جاتی ہیں۔ سو طرح کی ہیرا پھیری ہوتی ہے۔ کسی

کی عزت سے کھیلا جاتا ہے کسی کی محبت کو داغدار بنایا جاتا ہے سارا اینڈ
بھوک اور بیماری سے سسک کر مرجاتے ـــــ پرواہ نہیں ہے۔ جن کے پاس
دولت نہیں ہوتی وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح سیلاب میں بہہ جانے اور مرجانے
کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کا حق صرف انہیں ہوتا ہے جو ان لانچوں پر
کھڑے ہو کر اپنی راتوں کو رنگین بنانے کا سلیقہ جانتے ہیں۔

حمیدے شراب کی بوتل اور ایک گلاس لیکر بیٹھ گیا۔ اس کے آدمی شادو
کو اٹھانے گئے تھے۔ ان کے آنے تک وہ ذرا ایک آدھ پیگ کے سرور میں آ
جانا چاہتا تھا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی ڈالی اور اس میں پانی ملا
کر ہلکی ہلکی چسکی لیتا ہوا کھڑکی کے پاس آگیا۔ اور باہر رات کے اندھیرے
میں گھورنے لگا۔

نیچے پانی کا شور تھا۔ دور بہت دور مکانوں کی چھتوں پر لالٹین کی زرا
روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی بہت بڑھ گیا ہے۔ ایسی صورت
میں شادو کو اٹھا کر لانا مشکل ہو جاتا۔ مگر حمیدے کے پاس مکمل انتظام تھا۔
آج صبح ہی اس نے اپنے ایک آدمی کو شہر بھیج کر ٹرک کے پہیئے کا ایک
ٹیوب منگوا لیا تھا۔ اس ٹیوب میں ہوا بھر کر ایک اناڑی آدمی بھی پانی میں تیر
سکتا تھا۔ اس کے آدمی اپنے ساتھ وہ ٹیوب لے گئے تھے۔ تاکہ پانی بڑھ جائے
تو ڈوبنے کا خطرہ نہ رہے۔

ایک گھنٹہ بعد نچلی منزل سے اس کے آدمیوں کی آواز آئی۔
"چھوٹے صاحب ـــــ دروازہ کھولو!"
وہ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور دروازے کو کھول کر انہیں
ھنے لگا۔
وہ کسی لڑکی کو اٹھائے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ نظر نہیں
ا تھا۔ حمیدے نے اسے ٹٹول کر محسوس کیا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ اس نے پوچھا۔
"شادو ہے نا ـــــ؟"
"جی ہاں ـــــ ٹھیک اس کے دروازے پر سے اٹھا کر لائے ہیں۔"
یک نے جواب دیا۔
وہ سیڑھیاں چڑھ کر اسے اوپر کے کمرے میں لیجانے لگے۔ حمیدے دروازے
بند کرنے کے بعد ان کے پیچھے زینے طے کرنے لگا۔
اوپر کے کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ لڑکی کو چارپائی پر ڈالتے
ہی اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آگیا ـــــ دونوں ملازم اسے دیکھتے
ہی بوکھلا گئے۔ حمیدے نے کہا۔
"یہ کسے اٹھا لائے ہو۔ یہ تو کرم دین کی بیٹی ناصرہ ہے۔"
ایک ملازم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"چھوٹے صاحب ـــــ یہ مائی خیراں کے دروازے پہ کھڑی تھی۔ ہم

نے اندھیرے میں یہی سمجھا کہ شادو ہے۔"

"گدھے کے بچے ـــــــ!" حمیدے نے غصّے سے کہا۔ "ایک موقعہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اچانک سیلاب کے آنے کی وجہ سے لوگوں گھبراہٹ ہے وہ کل نہ ہو گی۔ ان کی پریشانیوں سے فائدہ اُٹھا کر ہی شادو کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

دوسرے ملازم نے کہا۔

"ہم ابھی جاتے ہیں۔ اسے ضرور لیکر آئیں گے۔۔۔۔"

"تو پھر جاؤ۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟"

ایک ملازم نے ناصرہ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"اسے واپس لے جائیں؟"

حمیدے نے چار پائی کی طرف دیکھا۔ ناصرہ بیہوش پڑی ہوئی تھی اسے اٹھا کر لانے میں جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ کیونکہ اس کا کُرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اور اس کا گورا چھپا تا ہوا بدن لباس کے پیچھے سے جھلک کر نگاہوں کو للچا رہا تھا۔

حمیدے نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ـــــ رہنے دو ـــــ جب شادو آجائے تو اِسے اس طرح غائب کر دینا کہ پنڈ والوں کو اس کا نشان تک نہ ملے۔۔۔۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ حمیدے نے کمرے کا دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر وہ نشہ میں لڑکھڑاتا ہوا آیا اور چار پائی پہ گرتے ہوئے ناصرہ کو جھنجوڑ کر بولا۔

"اے اٹھو ـــــ تمہاری تقدیر کے سونے کا وقت آگیا ہے۔۔۔"

ساجد کی پیشانی سے خون بہتے دیکھ کر ریشماں اچھل کر کھڑی ہو گئی پھر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر بولی۔

"یہ کیا ہو گیا ——؟ تم زخمی کیسے ہو گئے؟"

"گھبراؤ نہیں، زخم تو لگتے ہی رہتے ہیں۔" وہ ریشماں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کے ساتھ پلنگ تک آیا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سارے پنڈ میں قیامت آگئی ہے۔ کوئی جسم پہ زخم کھا رہا ہے، کوئی دل پر اور کوئی روح پہ —— خدایا! سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا مضبوط بندھن ٹوٹ گیا۔ کیا تیری یہی مرضی تھی کہ یہ پنڈ تباہ ہو جائے ——؟"

وہ بستر پہ لیٹ گیا۔ ریشماں اس کے قریب آکر اس پہ جھک گئی

پھر اس کی پیشانی پہ سے خون صاف کرنے کے لئے اس نے اپنا آنچل اٹھایا۔

ساجد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لمحہ بھر کے لئے نگاہوں کے سامنے شادو آئی اور پھر گم ہو گئی۔

ساجد نے ہولے سے کہا۔

"اپنا آنچل میلا نہ کرو۔ کوئی دوسرا کپڑا لے آؤ۔"

ریشماں نے جواب دیا۔

"تمہارے زخم کے لئے اس آنچل سے اچھا کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہے۔"

پیار میں ڈوبے ہوئے اس جواب کو سن کر ساجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی پیشانی سے خون پونچھنے لگی۔ اسے اپنے دل کی محبت اور ایک بیوی کی خدمت گذاری کا یقین دلانے لگی۔

یہ سچ ہے کہ شادو اس کی پہلی محبت تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ساجد ریشماں کا پہلا پیار تھا۔ وہ اگر شادو کے متعلق سوچتا تھا تو ریشماں کی تمام سوچیں بھی اپنے ساجد کے لئے تھیں۔

ریشماں کی محبت اور اپنائیت اسے سوچنے پہ مجبور کر رہی تھی کہ گذری ہوئی محبت کو یاد کر کے ریشماں کی ازدواجی زندگی سے بد دیانتی کرنا ناانصافی ہے —— اس بیچاری نے تو بارہا اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔ کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اسے معاف کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارتے ہوئے ساجد اسے سمجھ رہا تھا۔ اس کی نیک نیتی کا یقین کر رہا تھا۔ حویلی میں پرورش پانے والی ماں باپ کی اکلوتی لڑکی اپنی شاہانہ زندگی کو بھول کر ایک خادمہ کی طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔ اس کے پاؤں دباتی تھی۔ اس کے لئے بھوکی رہتی تھی۔ وہ جب تک نہیں سوتا تھا وہ بھی نہیں سوتی تھی۔ اور اس کا ایک زخم دیکھ کر یوں تڑپ جاتی تھی جیسے اس کے اپنے دل پہ وہ زخم لگا ہو۔

ساجد تھوڑی دیر تک اپنے اوپر جھکے ہوئے اس حسین چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اُسے اپنے بازوؤں میں لیکر سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"میں نے سوچا تھا کہ کل تمہیں یہاں سے لیکر چلا جاؤں گا۔ مگر اس سیلاب نے راستہ روک لیا۔ لوگوں کو اس مصیبت میں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں ان کے دُکھ درد میں کام آنا چاہیئے۔"

ریشماں نے کہا۔

"دوسروں کے کام آنا اچھی بات ہے۔ لیکن تم باہر جا کر اس طرح زخمی ہوتے رہے تو مجھے کتنی تکلیف ہو گی؟"

ساجد کو پھر شادو یاد آ گئی۔ وہ لڑکی بھی اسے اپنی نگاہوں کے سامنے ہمیشہ رکھنا چاہتی تھی۔ ساجد نے اسے سمجھایا تھا کہ محبت کی ہے تو سپاہی کی محبوبہ کا دل رکھو۔ اس نے ریشماں کو بھی سمجھایا۔

"ریشماں ـــــ! اب تم جناب علی کی بیٹی نہیں، ایک سپاہی کی بیوی ہو۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ سپاہی زخم کھانے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ زخم دوستوں سے بھی ملتے ہیں۔ اور دشمنوں سے بھی ـــــ آئندہ تم اپنی پریشانیوں کا واسطہ دیکر مجھے فرض کی ادائیگی سے نہ روکنا۔۔۔۔۔"

ریشماں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"آئندہ نہیں کہوں گی ـــــ مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو سمجھا دیا کرو ـــــ دھیرے دھیرے جب میں تمہارے مزاج کو سمجھ لوں گی تو پھر کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گی۔"

وہ ساجد کے سینہ پر اسکی بانہوں میں مسکرا رہی تھی۔ ساجد نے کہا۔

"تم بہت اچھی ہو ریشماں ـــــ ایسی باتیں کرتی ہو کہ دل جیت لیتی ہو ـــــ اُٹھو جاؤ ـــــ اب تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔"

اس نے کروٹ لیکر ریشماں کو اپنے اوپر سے لیتے ہوئے دائیں بازو لے بچھا لیا۔

ریشماں نے کہا۔

"ٹھہرو ـــــ! پہلے میں تمہارے سر پر پٹی باندھ دوں۔"

"رہنے دو ـــــ خون بند ہو چکا ہے۔"

"پھر بھی ـــــ احتیاطاً زخم پہ پٹی باندھ لینا چاہیئے۔"

"نہیں ـــــــ میرے پاس سے نہ جاؤ۔ میرے سینے سے لگی رہو۔ تم پاس ہوتی ہو تو میں بہت کچھ بھول جاتا ہوں۔"

ریشماں خوشی سے لہرائی اور اس کی گردن پر اپنی سانسیں چھوڑتی ہوئی بولی۔

"تمہاری پیار بھری باتیں سن کر میں اپنے آپ کو اس قدر خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی۔ میرا دل کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ تم مجھے دل سے معاف کر دوگے"

"میں نے دل سے تمہیں معاف کر دیا ہے ریشماں ـــــــ یقین کرو میرے دل میں تمہارے لئے ذرا بھی کھوٹ نہیں ہے۔ تم میری شریکِ حیات ہو۔ اگر تم سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اسے نظرانداز کرنا میرا فرض ہے۔"

وہ فرطِ مسرّت سے بل کھا کر اٹھ گئی اور اپنے دوپٹے کو پھاڑ کر اس کے سر پر پٹی باندھنے لگی۔

"یہ تم نے کیا کیا ـــــــ؟"

"میں تمہیں، تمہارے فرض سے نہیں روکتی۔ تم بھی مجھے، میرے فرض سے نہ روکو۔"

وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ ریشماں کی سانسیں اس کے چہرے پر مہک رہی تھیں۔ ناک کی کیل جگمگ جگمگ کرتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اور رس بھرے ہونٹ یوں ہولے ہولے کپکپا رہے تھے جیسے بھرے ہوئے جام میں شراب چھلکنے کے لئے لرز رہی ہو۔

ساجد نے اسے ہونٹوں سے چھو لیا۔

ریشماں کھو گئی۔ مدہوش ہو گئی۔ ساجد اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ اس کے گلابی رخساروں پر دہک رہا تھا۔ اس کے پیاسے ہونٹوں پہ برس رہا تھا اسکی چکنی اور شفاف گردن پر سانسوں کی دستک دے رہا تھا۔ وہ ٹوٹ رہی تھی۔ بکھر رہی تھی اور سیلابی لہروں کی طرح دُور دُور تک ساجد کو بہا کر لیجا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد صبح کی اذان سنائی دینے لگی۔

محبّت کی رنگینیوں اور سیلاب کی اذیّتوں میں ڈوبی ہوئی ایک رات گذر گئی۔

ریشماں اس کے سینے سے لگی لیٹی رہی۔ ساجد اسکی پشت کو ہولے ہولے سہلاتا رہا ـــــــ ریشماں نے کہا۔

"صبح ہو گئی ہے۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ کھانے کے بعد سو جانا...."

ساجد نے کہا۔

"اناج بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا ہو گا ریشماں ـــــــ نہ جانے یہ سیلاب کتنے دنوں تک رہے گا۔؟"

"تم فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں اتنا اناج ہے کہ ہم چھ ماہ تک بیٹھ کر کھا سکتے ہیں ـــــــ ابّا نے کل رات ہی کو کھانے پینے کی تمام چیزیں اوپر پہنچا دی تھیں۔"

"اچھا ـــــــ!" ساجد نے تعجّب سے پوچھا کیا انہیں پہلے ہی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔؟"

"انہوں نے جس احتیاط سے کام کیا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ امّی اُن سے پوچھتی ہی رہیں۔ لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ بُرا وقت پوچھ کر نہیں آتا —— انہوں نے اپنے تمام مویشیوں کو بھی کہیں بھجوا دیا ہے —— اللہ! وہ کتنے سمجھدار ہیں۔ اگر وہ پہلے سے خطرے کو محسوس نہ کرتے تو ہمارا تمام اناج اور مویشی برباد ہو جاتے ......"

واقعی تمہارے ابّا جیسے لوگ ہی دولت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ —— اور اس بات پہ حیران ہوں کہ کل رات جبکہ ہم گنہگار کی حیثیت سے پکڑے گئے۔ اور تمام رات ایک ہنگامہ برپا رہا۔ تو اس ہنگامہ کے دوران بھی تمہارے ابّا آنے والے سیلاب کے متعلق سوچتے رہے۔ اور خاموشی سے تمام سامان اوپر پہنچاتے رہے —— بیٹی کی عزّت اور خاندان کا وقار خطرے میں پڑ جائے تو انسان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ لیکن تمہارے ابّا کو اس وقت بھی سیلاب کا خطرہ نظر آ رہا تھا۔"

"اونہہ ——!" ریشماں نے کہا۔ "ابّا کو میری عزّت اور خاندانی (؟) کا اتنا ہی خیال ہوتا تو وہ دس جگہ میرا رشتہ کر کے مجھے تماشہ نہ بناتے —— وہ ایسے ہی بے حس ہیں کہ دولت کے سامنے کسی رشتے کو اہمیت نہیں دیتے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو تمہارے ابّا کو تمہارا ذرا بھی خیال ہوتا تو کل تم گمراہ نہ ہوتیں —— میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔ واقعی تم پہ زیادتی ہوئی ہے۔"

ریشماں نے اپنے چہرے کو اس کے چہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے سلجے! —— بس میں یہی چاہتی ہوں کہ تم میری مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھ لو —— مَیں ایمان سے کہتی ہوں کہ مجھے ایک طرح کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ جو آئے دن میرے لئے فسادات ہوتے ہیں تو ان فسادات کے دوران کوئی مجھے اغوا کر سکتا تھا۔ نہ جانے میں کس ذلیل اور کمینے کے ہتھے چڑھ جاتی۔ تمہیں دیکھتے ہی میرے دل نے کہا کہ میری عزت کی حفاظت کرنے والا تم سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ پھر مَیں نے تمام اخلاقی قدروں کو بھلا دیا اور آنکھیں بند کر کے تمہاری آغوش میں آ گئی —— مَیں تمہاری محبت اور تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں نے جو بُرائی کی، تم اُسے اچھائی میں بدل رہے ہو۔ مَیں اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی لیکن تم نے مجھے اٹھا کر دل میں بٹھا لیا۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے تمہارے جیسا خاوند ملا ہے" —— وہ بڑی عقیدت سے کہتی جا رہی تھی اور بڑی محبت سے اُسے چومتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اپنے ملائم رخساروں کو رگڑتی جا رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ سلجے کا دل بن کر اس کے سینے میں اتر جاتی اور تمام عمر وہاں دھڑکتی رہتی ......

اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔

وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ باہر سے جناب علی کی آواز آ رہی تھی۔

"ساجے —— باہر آؤ۔ تم سے ضروری کام ہے۔"

ساجد پلنگ سے اتر کر دروازے کے پاس آیا اور اُسے کھول کر باہر گیا۔

"کیا بات ہے —— ؟" اس نے پوچھا۔ تم کچھ گھبرائے ہوئے ہو؟"

جناب علی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"آں —— ہاں —— پنڈ کی دو لڑکیاں لاپتہ ہیں —— اور وہ چوہدری فضل دین میری حویلی کی طرف دیکھ کر ایسے چیخ رہا ہے جیسے میں نے ہی ان لڑکیوں کو غائب کیا ہو —— دیکھو تم ہی سوچو —— یہ پنڈ والے میرے متعلق کیا سوچیں گے۔"

ریشماں کی ماں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"توبہ توبہ —— خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے۔ پھر بھی یہ لوگ گناہوں سے باز نہیں آتے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے قیامت آچکی ہے۔ دیکھ لینا اس سیلاب میں ساری دنیا غارت ہو جائے گی۔"

ساجد، جناب علی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر منزل کی چھت پر آیا۔ گلی کی دوسری طرف حویلی کے سامنے کرم دین کا مکان تھا اس کے بی خیراں کی چھت پر شادو نظر آ رہی تھی۔ اس کے دو مکانوں کے بعد چوہدری کی کوٹھی تھی۔

چودھری اپنی چھت پر رائفل لئے کھڑا تھا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر چیخ رہا تھا۔

"اوے میرا نام چودھری فضل دین ہے —— میری بیٹی کو اٹھا کر لے جانے والو سن لو —— مَیں تمہارے گھر کے ایک ایک بچے کو ذبح کر کے رکھ دوں گا —— اوئے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر تم زندہ نہیں رہ سکتے۔"

دوسری طرف کرم دین اور اس کی بیوی کی آہ و زاری سنائی دے رہی تھی۔

"ہائے میری بیٹی —— ہائے میری ناصرہ —— مَیں تجھے کہاں ڈھونڈوں کس سے فریاد کروں —— میرے پاس نہ دولت ہے نہ طاقت ہے —— مَیں دشمنوں سے کس طرح لڑوں —— کس طرح تیری عزت بچاؤں۔ تو کہاں چلی گئی بیٹی ......؟"

باپ دہائی دے رہا تھا۔ ماں چھاتیاں پیٹ رہی تھی۔ صبح کی دھندلی روشنی میں مرد عورتیں اور بچے دُور دُور تک مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی خاموش نہیں تھے۔ سب ایک دوسرے کی طرف منہ کئے چیخ چیخ کر اپنا درد سنا رہے تھے۔ کسی کی بیٹی غائب تھی۔ کسی کا بیٹا لاپتہ تھا۔ کسی کے ننھے ننھے بچے ڈوب گئے تھے۔ کوئی یتیم ہو گیا تھا۔ کوئی لاوارث ہو گئی تھی۔ کسی کا جہیز بہہ گیا تھا اور کسی کا پورا مکان سیلاب

میں بیٹھ گیا تھا۔

ساجد نے چودھری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھری ـــــ دشمنوں کو للکارنے سے بیٹی واپس نہیں ملے گی۔ تمہارا غصے میں آنا فطری بات ہے۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ غصے کو برداشت کرو اور ٹھنڈے دل سے سوچو کہ تمہاری عزت اور جان و مال کا دشمن کون ہے ہم اس کے گھر کی تلاشی لیں گے۔ جس نے بھی تمہاری بیٹی کو چھپا رکھا ہے ہم اسے قانون کے حوالے کریں گے۔"

چودھری نے بگڑ کر کہا۔

"اوئے تیرے قانون کی ایسی تیسی ـــــ میں اپنے دشمن کو اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

ساجد نے کہا۔

"چودھری ـــــ تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔ جاؤ جتنی دیر چیخ سکتے ہو چیختے رہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میں قانون کا محافظ ہوں ـــــ میں کسی کو قانون کے خلاف قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دونگا۔"

"ہاں ہاں۔ میں سب سمجھتا ہوں"۔ چودھری نے کہا۔ جناب علی نے تجھے اسی لئے داماد بنایا ہے کہ تو قانون کی آڑ لے کر اس کی حفاظت کرے۔"

"بکواس مت کر" ـــــ جناب علی نے گرج کر کہا۔ "کیا تو سمجھتا ہے کہ

تیری بیٹی کو میں نے اغوا کیا ہے؟ ـــــ آ ـــــ ابھی آ ـــــ اور میرے گھر کی تلاشی لے۔ نہ میں نے چوری کی ہے اور نہ ہی مجھے کسی کا ڈر ہے۔"

"ہاں! ـــــ میں تلاشی لونگا۔ تیری حویلی کا ایک ایک کونہ دیکھوں گا اور پنڈ سے باہر پرانے کے پاس جو تیرا مہمان خانہ ہے میں اس مہمان خانے کی بھی تلاشی لوں گا۔"

جناب علی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

چودھری اپنی چھت پر سے واپس چلا گیا تھا۔ شاید وہ تلاشی لینے کے لئے آ رہا تھا۔ جناب علی نے سہمے ہوئے لہجے میں ساجد سے کہا۔

"یہ بڑی زیادتی ہے۔ میں تو کل رات سے حویلی میں ہوں۔ میرے مہمان خانے میں کیا ہو رہا ہے۔ میں کیا جانوں ـــــ؟ یہ چودھری بڑا مکار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے مجھے پھنسانے کے لئے اپنی ہی بیٹی کو خود ہی وہاں بھیج دیا ہو۔"

"میں نے مانا"۔ ساجد نے کہا۔ آدمی کتنا ہی مکار ہو۔ وہ اپنے دشمن کو ذلیل کرنے کیلئے اپنی ہی بیٹی کو داؤ پر لگا کر کبھی اکلوتی بیٹی کی بدنامی قبول نہیں کر سکتا۔"

جناب علی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

چودھری اپنی بیٹی کیلئے ایسا نہیں کر سکتا لیکن تھانیدار تو ایسا کر سکتا ہے

وہ ایسی ہیرا پھیری جانتا ہے۔ ایک گھر کا مال چرا کر دوسرے گھر ڈال سکتا
وہ میرا نام پرانا دشمن ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ لوگ کس طرح می
خلاف سازش کرتے رہتے ہیں۔"

ساجد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر بڑے ہی ٹھہرے ہو
انداز میں کہا۔

"سازش، جھوٹ اور مکر و فریب زیادہ عرصہ تک چھپا نہیں رہتا۔ اگر
سچے ہو تو تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

جناب علی سر جھکا کر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ پھر وہ خاموشی سے پلٹ ک
دوسری منزل کی طرف جانے لگا۔

اس کے جاتے ہی ساجد کی نظریں بھٹک کر شادو کی طرف چلی گئیں۔ ا
دیر تک وہ دوسروں سے باتیں کرتا رہا تھا لیکن ذہن کی آنکھیں شادو کو
دیکھ رہی تھیں۔ اسے نہ دیکھ کر بھی وہ دیکھ رہا تھا کہ شادو چھت پ
ہے اور اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

اب جو اس نے سچ مچ اس کی جانب دیکھا تو مائی خیراں نے شاد
سے کہا۔

"اے شادو! ــــ چل ادھر آ کے بیٹھ ــــ لوگ اسی لئے
اونچی چھت پر آتے ہیں کہ پرائی بہو بیٹیوں کو تاکتے رہیں۔"

ساجد نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور کرم دین سے کہا۔

"چاچا صبر کرو ــــ میں ابھی جا کر ناصرہ کو تلاش کرتا ہوں۔ میں نے
پنی ماں کا دودھ پیا ہے تو یہ ثابت کر کے دکھاؤں گا کہ پرائی بہو بیٹیوں کی
س طرح عزت کی جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ مائی خیراں تھوڑی دیر تک اس چھت
کو دیکھتی رہی جہاں بیٹا کھڑا تھا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی رونے لگی۔

جس لڑکی کے پاس عزت کا سرمایہ
نہ ہو اُس سے زیادہ غریب دنیا میں
اور کوئی نہیں ہوتا اور یہ غریبی اسے
ایک نیکی کے بدلے مل رہی تھی۔

رالو ہوش میں آنے کے بعد بھی چاروں شانے چت پڑی رہی۔ وہ گردن
بلکہ پاؤں تک رسیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ منہ پہ اس طرح کپڑا بندھا ہوا تھا
وا یخ چیخ کر کسی کو مدد کے لئے پکار بھی نہیں سکتی تھی۔
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ایک
با کمرہ تھا جس میں قیمتی فرنیچر تھا۔ وہ جس پلنگ پر پڑی ہوئی تھی اس
ے ملائم اور آرام دہ تھے۔ اس پنڈ میں ایسی قیمتی چیزیں صرف چودھری
ادین اور جناب علی کے گھروں میں پائی جاتی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے
لہیں یہ جناب علی کا گھر تو نہیں ہے۔
رالو اپنے ماں باپ سے سنا کرتی تھی کہ جناب علی بڑا ہی بدکار آدمی ہے
ؤں کی عورتوں کو میلی نظروں سے دیکھتا ہے۔ شہر سے جو بابو لوگ آتے ہیں وہ

اس کے مہمان خانے میں ٹھہرتے ہیں اور جناب علی کی مہربانیوں سے رات ا
رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ بہت سی ایسی شرمناک باتیں تھیں جسے رابو سُ
گوارا نہیں کرتی تھی۔

اب اس کمرے کو وہ سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی اسے یقین
تھا کہ جس گناہ آلود مہمان خانے کا ذکر وہ سنتی آئی تھی آج اس کی بدنصیبی نے
اسی عشرت کدے میں پہنچا دیا ہے۔ وہ رسیوں کے شکنجے سے آزاد ہونے
تڑپنے لگی۔ جسم کو بل دے دیکر اپنی تمام قوتیں صرف کرنے لگی۔ مگر رسی بہت
تھی اور وہ نازوں کی پلی جاگیر دار کی بیٹی بہت کمزور تھی۔ وہ تھک ہار کر
لگی اور گردن ادھر سے اُدھر گھما کر سہمی ہوئی نظروں سے اس طرح دیکھنے
جیسے کسی مددگار کو تلاش کر رہی ہو۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور
لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی مسکراتا ہوا اس کے قریب آنے لگا۔

رابو اسے پہلی ہی نظر میں پہچان کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ
کا ملازم تھا اور اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے سارے پنڈ میں کالے خاں کے
مشہور تھا۔ رابو اسے دیکھ کر رسیوں میں تڑپنے لگی جیسے ابھی شکنجے سے نکل
گی۔ منہ بند ہونے کی وجہ سے اس کی چیخیں حلق میں ہی اوں۔ اوں کی آ
ساتھ گھٹ رہی تھیں۔ کالے خاں نے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے

"ہی ہی ہی ہی ـــــ یہ جوانی رسیوں میں تڑپنے کے لئے نہیں

اوں میں مچلنے کے لئے ہے۔ ماں قسم کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چودھری کی
ٹا اتنی آسانی سے ہاتھ آجائے گی"۔

"اوں ۔ اوں ....." وہ اِدھر سے اُدھر سر جھٹکنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے
ہو بہہ رہے تھے۔ کالے خان نے اپنی ہتھیلی کے پنجے میں اس کے دونوں
مادوں کو جکڑ کر کہا۔

"روتی ہے ـــ ہی ہی ہی ـــ تیرے بھائی کے رنگ محل میں بھی غریب
ہی طرح روتی ہیں ـــ نہ رو میری جان۔ آنسو عورت کو اور زیادہ حسین
تے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ابھی تیری بوٹی بوٹی چبا جاتا ـــ مگر کیا
شکار پر پہلے مالک کا حق ہوتا ہے۔ ہم تو جھوٹا کھانے والے ملازم ہیں۔
ہی ہی ہی....."

رابو بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ کبھی کسی نے اس کے سامنے سر اٹھا کر بات
کی تھی مگر آج ایک معمولی ملازم اس سے ایسی شرمناک باتیں کر رہا تھا۔ اپنی
ن کے خیال سے وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ مارے شرم کے سُرخ ہوتی جا رہی
اور خود کو مجبور، بے بس اور بے یار و مددگار دیکھ کر زار و قطار روتی جا رہی تھی۔

وہ سارے سے نیکی کرنے نکلی تھی اور بدی کے جہنم میں پہنچ گئی تھی۔ اس کا
ری باپ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اس دنیا میں صرف اپنے آپ سے نیکی کرنا چاہیئے
دوسروں سے نیکی کرنے میں انسان خود غریب ہو جاتا ہے اسی لئے تو اس کا

باپ دوسروں کا خون چوس کر امیر بن گیا تھا۔ آج اس کی بیٹی اپنی عزت کو
میں ڈال چکی تھی۔ جس لڑکی کے پاس عزت کا سرمایہ نہ ہے اس سے زیادہ
دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتا اور یہ غریبی اسے ایک نیکی کے بدلے مل رہی تھی۔
اب وہ اپنی حماقت پر رو رہی تھی۔ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ ساجے سے
کرتی۔ کیا ساجے اس کی عزت بچانے کے لئے آجائے گا۔؟ نہیں۔ وہ تو اتنا
جانتا ہے کہ چودھری کی بیٹی اس کے لئے کیا جذبات رکھتی ہے اور اسی کی خا
ہونے کے لئے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔

اس کے آنسو نہیں تھم رہے تھے اس کے سر کے اطراف تکیہ آنسوؤں
بھیگتا جا رہا تھا۔ کالے خان ہنستے ہوئے اپنی کالی بھدی اور سخت انگلیوں
کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ اپنے چہرے کو ادھر اُدھر گھما کر اس کی کھردری انگلیو
بچنا چاہتی تھی اور وہ قہقہے لگاتا ہوا اسے چھیڑتا جا رہا تھا۔

جوان لڑکی تڑپتی ہو تو اسے دیکھ کر بڑا مزہ آتا ہے۔ ہی ہی ہی
ہو کر اتنا زور لگاؤ گی تو تھک جاؤ گی۔ صبح ہو چکی ہے کچھ کھانے کے لئے لاؤ
وہ غصے اور نفرت سے اُسے دیکھنے لگی اور سر ہلا کر انکار کرنے لگی۔
" ہی ہی ہی ـــــ انکار نہیں چلے گا۔ یہاں ہماری مرضی چلے گی۔
تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ میں زبردستی منہ کھول کر روٹیاں ٹھونسوا
نہیں کھاؤ گی تو گلا دبا دوں گا۔ ہی ہی ہی ....." وہ ہنستے ہوئے روٹ

لئے وہاں سے پلٹ گیا۔ اسی وقت جناب علی کا دوسرا ملازم ہانپتا کانپتا دروازے
اور گھبرا کر بولا۔
کالے خان ـــــ غضب ہو گیا۔ چودھری اپنی بیٹی کو تلاش کرتے ادھر آ رہا
ـــــ رالو کا چہرہ یک بیک خوشی سے کھل گیا۔ کالے خان نے غرا کر کہا۔
آنے دے ـــــ اس کی موت اسے یہاں لا رہی ہے۔"
نہیں کالے خان ـــــ جناب علی اور ساجے بھی ساتھ ہیں۔ جناب علی نے
پہلے سے بھیجا ہے کہ میں تجھے ہر بات اچھی طرح سمجھا دوں۔ چودھری سے جھگڑا
مناسب نہیں ہے۔ تمام پنڈ والے خلاف ہو جائیں گے۔ جناب علی نے کہا ہے
دیہاں سے نکال کر لے جاؤ۔ وہ جو پیچھے جنگل ہے نا۔ وہاں لے جا کر چھپا
تب چودھری اور ساجے مطمئن ہو کر یہاں سے چلے جائیں گے اور خطرہ ٹل جائے
چھت پر آ کر سفید جھنڈی دکھاؤں گا تو تم رالو کو لے کر واپس آ جانا۔ چل
وہ لوگ حویلی کی تلاشی لے چکے ہیں۔ اب اسی طرف آ رہے ہونگے۔ میں
گاڑی کے پہیئے تیار رکھتا ہوں" ـــــ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔
کالے خان پلنگ کے پاس آ کر رالو کی رسی کھولنے لگا۔ تھوڑی دیر کیلئے رالو کو جو
آشا تھی وہ مایوسی میں بدل گئی۔ اس کا باپ قریب آنے والا تھا اور دشمن اسے
بچانا چاہتے تھے۔ رسی کھلتے ہی وہ کالے خان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش
لیکن وہ ایسا حلیم شحیم اور پتھر کی طرح سخت تھا کہ رالو اس کی گرفت میں تڑپ

سکتی تھی مگر نکل نہیں سکتی تھی۔ کالے خان نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت
طرف لیجا کر باندھ دیا۔ پھر اس کے دونوں پاؤں کو بھی رسیوں سے جکڑ دیا۔ اس کے
اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور کمرے سے نکل کر نچلی منزل کی طرف جانے لگا
مہمان خانے کے دروازے کے باہر ٹرک کے دو ہوا بھرے ہوئے ٹیوب
میں بندھے ہوئے تھے اور پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ ملازم انہیں دونوں ہاتھ
پکڑے کھڑا تھا۔ کالے خان نے قریب آکر رابو کو اس پر لٹا دیا۔ وہ تڑپنے اور
دونوں ٹیوب ہچکولے کھا کر پانی میں ڈوبنے اور ابھرنے لگے۔ کالے خان نے غ
"تم سیدھی طرح قابو میں نہیں آؤ گی" ——— اس نے رابو کو اٹھا کر
پھینک دیا۔ وہ پانی میں ڈوبی۔ اس کا دم الجھنے لگا۔ کالے خان نے اسے
نکالا اور پھر ڈبویا۔ پھر نکالا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ منہ بند تھا۔ وہ چیخ
تھی۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ وہ تڑپنا چاہتی تو پھر پانی میں چلی جاتی
حواس باختہ ہو کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ زندہ بھی ہے
کالے خان نے اُسے جھنجھوڑ کر کہا۔
"اب تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ مرتے وقت کتنی تکلیف ہوتی ہے
سیدھی طرح میرے ساتھ چلو گی یا نہیں ——— ورنہ پھر پانی میں پھینکتا ہوں
وہ سہم کر جلدی سے اثبات میں گردن ہلانے لگی۔
کالے خان نے اسے اٹھا کر ٹیوب پر ڈال دیا اور ملازم سے

"پانی بڑھنے کا خطرہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تیری جھنڈی کے انتظار میں ہی
پاؤں۔ پانی کمرے اونچا ہو گیا تو میں تیر نہیں سکوں گا"۔
"گھبرا مت۔ جیسے ہی چودھری واپس جائے گا۔ میں چھت پر آکر جھنڈی
دوں گا"۔
کالے خان نے گھوم کر ٹیوب کے ایک سرے کو پکڑا اور پھر پانی میں اسے
تے ہوئے جنگل کی طرف لے جانے لگا۔ رابو دونوں ٹیوبوں پر چت پڑی ہوئی
پ میں چمکتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ نیچے پانی تھا۔ اوپر آسمان
اور اس کی تقدیر کی لگام ایک درندے کے ہاتھ میں تھی۔
پھر وہ پھولوں کی سیج پر سونے والی شہزادی موت کے بستر پر لیٹے ہی لیٹے
ہت دُور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔
پندرہ بیس منٹ کے بعد چودھری فضل دین، جناب علی اور ساجے دونو جوانوں
ہاتھ وہاں پہنچے۔ اوپری منزل میں صرف دو کمرے تھے۔ جناب علی اس
ے میں آکر اطمینان سے بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر پہلے رابو قید تھی۔ پلنگ خالی پڑا
تھا۔ کمرے کی تمام چیزیں خاموش تھیں اور اپنی گونگی زبان سے یہ نہیں بتا سکتی
ں کہ یہاں سے ایک معصوم لڑکی ابھی ابھی کہیں غائب کر دی گئی ہے۔
وہ لوگ دونوں کمروں کا ایک ایک کونہ دیکھتے رہے۔ ہر چیز اُلٹ پلٹ کر
ی۔ وہ چھت پر بھی گئے اور نچلی منزل میں جہاں گھٹنوں سے اوپر تک پانی بھرا

ہوا تھا اور جہاں کسی کو چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں بھی انہوں
اپنی تسلی کے لئے اسے تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملی۔

وہ تھک ہار کر پھر اسی کمرے میں آ گئے۔ جناب علی نے طنزیہ انداز میں
"اب بتاؤ چودھری ـــــ مجھ پر جھوٹا الزام لگا کر تمہیں شرم آ رہی ہے
نہیں" ـــــ چودھری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جس کمرے میں اب تک
روتی رہی تھی وہاں اب باپ رونے لگا۔

"میں کیا کروں ـــــ کیسے الزام دوں ـــــ؟ ساجد! تم ٹھیک کہتے تھے
کو للکارنے سے بیٹی نہیں مل سکتی۔ وہ میری پھول جیسی بیٹی ہے۔ ہم نے
لاڈ پیار سے اُسے پالا ہے اور آج وہ نہ جانے کس ظالم کے ظلم کا شکار ہو رہی ہے
میں کہاں جاؤں۔ اسے کہاں تلاش کروں۔ نہ میں اسے اپنی دولت سے واپ
بلا سکتا ہوں اور نہ اپنی طاقت سے۔ آج میں صرف ایک بیٹی کا باپ ہوں او
دنیا کا سب سے کمزور انسان ہوں"۔

ساجد نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"چودھری! مجھے احساس ہے کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ تم خدا
رکھو۔ تمہاری بیٹی ضرور تمہیں واپس ملے گی۔ ہمیں ناصرہ کو بھی تلاش کرنا ہے
مکان کی تلاشی لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اغوا کرنے والے اس سیلاب میں لڑ
کو کہیں دُور نہیں لے جا سکیں گے"ـــــ یہ کہتے ہوئے وہ ان کی طرف

گھوم کر پلنگ کی طرف آیا۔ بستر کی چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے
تھوڑی دیر پہلے یہاں کوئی سو تا رہا ہے۔ یہ کوئی شبہ کی بات نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے
کہ یہاں کا ملازم اپنے مالک کی عدم موجودگی میں اس بستر پر سوتا رہا ہو۔ لیکن اس تکیے
نے چغلی کھائی کہ یہاں ملازم نہیں کوئی دوسری ہستی تھی۔ تکیہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔
ساجد آنسوؤں کو تو نہ سمجھ سکا مگر اس تکیہ کے گیلے ہونے پر غور کرنے لگا۔ جو حصہ گیلا
تھا اس حصہ میں کہیں کہیں تیل جیسی چکناہٹ بھی تھی۔ لڑکیاں بالوں میں تیل لگا
کر کنگھی چوٹی کر کے بستر پر لیٹتی ہیں تو تکیہ پر ایسی ہی میلی چکناہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

ساجد تھکے ہوئے انداز میں پلنگ پر گر پڑا اور تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔
جناب علی چودھری کو مشورہ دے رہا تھا کہ اُسے تھانیدار کے گھر کی تلاشی لینا چاہیئے
ایک نوجوان نے کہا۔

ساجد صاحب تو ابھی سے تھک کر پلنگ پر گر پڑے ہیں۔ ان کے بغیر
تھانیدار ہمیں اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیگا"۔

ساجد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں بھئی ـــــ میں تھکنے والا آدمی نہیں ہوں۔ بعض اوقات سیاہی گرتا
بھی ہے تو محض پینترا بدلنے کے لئے۔ تم ایسا کرو کہ دروازہ اندر سے بند کر دو"۔

"دروازہ بند کر دوں" ـــــ؟ نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔

جناب علی بھی اسے تعجب سے دیکھنے لگا۔ ساجد نے کہا۔

"میں جو کہتا ہوں ویسا ہی کرتے جاؤ ـــــ دروازہ بند کرو اور وہاں کھڑے ہو جاؤ اور میری اجازت کے بغیر کسی کو کمرے سے باہر نہ جانے دو۔"

اس نوجوان نے حکم کی تعمیل کی اور دروازہ بند کر کے وہاں کھڑا ہو گیا۔

جناب علی کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم ہمیں اس کمرے میں قید کر رہے ہو؟"

"ہاں"۔ اس نے ملازم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ـــ "کیا یہ ملازم اب سے ایک گھنٹہ پہلے حویلی میں نہیں تھا؟ چودھری حویلی کی تلاشی لے رہا تھا۔ ہم سب مصروف تھے اور یہ وہاں سے یہاں چلا آیا ـــــ جواب دو کہ یہ ہم سے پہلے یہاں کیوں آ گیا؟"

جناب علی نے کہا۔

"میں نے اسے بھیجا تھا کہ مہمان خانہ کھول کر صفائی کر دے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ملازم کے آنے سے پہلے یہاں کوئی نہیں تھا۔"

"کوئی نہیں تھا۔ یہاں تالا پڑا ہوا تھا۔"

اچانک ہی ساجد کا ایک اُلٹا ہاتھ جناب علی کے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا کر لگ گیا۔

"میں اس وقت تمہارا داماد نہیں ہوں۔ ایک فوجی کیپٹن ہوں۔ مجھ سے جھوٹ بولو گے تو ایسی اذیتیں دیکر ماروں گا کہ دیکھنے والے تھرا جائینگے۔ بولو۔ رابو کہاں ہے؟"

اس کی آواز ایسی تھی جیسے رائفل کی گولی نکلی ہو۔ جناب علی اپنی بائچھوں سے خون پونچھتے ہوئے کپکپا کر بولا۔

"بس ساجے ـــ تم غلط سمجھ رہے ہو ـــــ تم مجھے بھی تو سمجھاؤ کہ تم مجھ پر شبہ کیوں کر رہے ہو"۔؟

ساجد نے پلنگ سے تکیہ اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو ـــ یہ تکیہ پانی سے نہیں آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ کوئی مظلوم لڑکی اس پر سر رکھے روتی رہی ہے۔ پہلے میں نے سوچا کہ شاید وہ ناصرہ ہو گی لیکن نہیں۔ ناصرہ ایک غریب لڑکی ہے۔ وہ ایک مہنگا اور خوشبودار تیل اپنے بالوں میں نہیں لگا سکتی ـــ لو چودھری دیکھو۔ اس تکیہ میں ابھی تک اس تیل کی خوشبو باقی ہے" ـــــ اس نے تکیہ کو چودھری کی طرف اچھال دیا۔ چودھری لپک کر اسے سونگھنے لگا۔ پھر جوشیلے انداز میں بولا۔

"ہاں ـــ یہ تیل میں نے شہر سے منگوایا تھا ـــ تم ٹھیک کہتے ہو ساجے ـــــ اس حرامزادے نے میری بیٹی کو کہیں چھپا دیا ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"

وہ چیختا ہوا جناب علی کی طرف بڑھا لیکن ساجد نے اسے پکڑ کر پرے دھکیل دیا اور سختی سے کہا۔

"چودھری ـــ اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے یہاں کوئی قانون کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے گا۔"

پھر وہ غراتی ہوئی نظروں سے جناب علی کو دیکھتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کا گریبان پکڑ کر بولا۔

"صرف ۔۔ ہاں ۔۔ یا ۔۔ ناں میں جواب دو۔ کیا رالو زندہ ہے؟"

"نہیں ۔۔ یہاں رالو کبھی نہیں آئی ۔۔۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ۔۔۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ساجد نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور سے دیوار پر مار دیا۔

"آہ" ۔۔۔ جناب علی کے حلق سے چیخ نکلی۔

ساجد نے دوسری بار اپنے سر سے ٹکر ماری۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ خود کو ساجد کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ناکام کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ ساجد کے ہاتھ دو آہنی شکنجوں کی طرح اس کی کھوپڑی کو جکڑے ہوئے تھے وہ سامنے سر سے ٹکر مار رہا تھا اور پیچھے دیوار سے اسے ٹکرا رہا تھا۔ ہر ٹکر پر اُسے خدا یاد آ رہا تھا۔ سر سے خون بہنے لگا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب کسی بھی لمحہ اس کا سر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

آخرکار وہ دم توڑتی ہوئی آواز میں بولا۔

"زندہ ہے ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ زندہ ہے۔"

ساجد نے اُسے چھوڑ دیا۔ اس کے ہاتھوں سے چھوٹتے ہی وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر پڑا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کراہنے لگا

کالے خان رالو کو لئے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور وہاں سے دور بہت دور درختوں کے درمیان سے جھلکتے ہوئے مہمان خانے کو دیکھ رہا تھا۔

مہمان خانہ کی آدھی چھت نظر آتی تھی۔ اس کے نیچے دوسری منزل کی دیوار تھی اور دیوار سے نیچے وہ دروازہ دکھائی دیتا تھا جو آدھا سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ خود بھی سیلاب میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا اور دل ہی دل میں چودھری وغیرہ کو گالیاں دے رہا تھا اس کے سامنے ایک حسین وجمیل لڑکی ٹیوب پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ لیجا سکتا تھا لیکن موجودہ خطرے کے پیش نظر اسے چھیڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ دست درازی کرتا اور رالو مچل کر پانی میں گرتی یا دونوں ٹیوب سے ہٹ کر جھاڑی سے باہر آ جاتے تو مہمان خانے سے انہیں کوئی دیکھ سکتا تھا اور پھر جلد بازی کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھی۔ بس تھوڑی دیر کی بات تھی۔ چودھری وغیرہ کے جاتے ہی یہ لڑکی پھر ان کے عشرت کدے میں پہنچ جاتی۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ لوگ مہمان خانے سے نکلتے ہوئے نظر آئے۔ دور سے ان کے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ صرف چودھری اپنی پگڑی کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ کالے خان نے انہیں مہمان خانے میں داخل ہوتے وقت بھی دیکھا تھا وہ پانچ آدمی تھے وہ سب بستی کی طرف واپس جا رہے تھے۔

پھر وہ گھنے درختوں کے باعث نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ کالے خان بے چینی

سے چھت کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ پانی میں کھڑے کھڑے اکتا گیا تھا۔ اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں پانی بڑھ نہ جائے۔ اسے اچھی طرح تیرنا نہیں آتا تھا۔ وہ جہاں چھپا ہوا تھا وہاں کیچڑ بہت تھی۔ اس کے پاؤں ایک طرف دھنستے تو وہ دوسری طرف چلا آتا تھا۔

ٹھیک دس منٹ کے بعد چھت پر وہ لال قمیض پہنے ملازم نظر آیا اور سفید جھنڈی لہرانے لگی۔

کالے خان ٹیوب کو کھینچتے ہوئے جھاڑی سے نکل آیا اور مہمان خانے کی طرف جانے لگا۔ رالو گم سم پڑی ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ نہ بول رہی تھی اور نہ رو رہی تھی۔ خاموشی سے چت لیٹی ہوئی سر کے اوپر پھیلے ہوئے درختوں کو دیکھتی جا رہی تھی پھر درخت گذر گئے اور نیلا آسمان نظر آنے لگا۔ ملازم چھت سے چلا گیا تھا۔ کالے خان تیزی سے چلتا ہوا مہمان خانے تک کھلے ہوئے دروازے سے ٹیوب سمیت داخل ہوتے ہوئے ملازم کو آواز دینے لگا۔

"میں یہاں ہوں"۔ دروازے کے پیچھے سے ساجد کی آواز سنائی دی۔

کالے خان نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ جس دروازے سے گزر کر وہ اندر داخل ہوا تھا وہاں ساجد ملازم کی لال قمیض پہنے ہوئے نظر آ رہا تھا اور اب آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی کالے خان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ ساجد پیچھے

بدل کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ چھلانگ لگاتا ہوا آیا اور پانی میں غڑاپ سے ڈوبتا چلا گیا۔ لہروں کی ہلچل سے ٹیوب ڈگمگانے لگے۔ رالو حیرت اور خوشی سے ساجد کو دیکھ رہی تھی جس کی حفاظت کے لئے وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال چکی تھی اب وہی اس کی حفاظت کے لئے آگیا تھا۔

کالے خان ہڑبڑا کر پانی سے ابھرا تاکہ فوراً ہی سانس درست کر کے دوسرا حملہ کرے لیکن اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ پڑا اور وہ الٹ کر پھر پانی میں چلا گیا۔ لہروں میں اور زیادہ ہلچل پیدا ہو گئی۔ ٹیوب بری طرح ہچکولے کھانے لگے۔ گرداب کی طرح گول چکر لگانے لگے۔ رالو نے سر گھما کر ساجد کی طرف دیکھنا چاہا تو ٹیوب ایک جانب جھک گئے اور وہ غڑاپ سے پانی میں چلی گئی ساجد کا دھیان دشمن کی طرف سے ہٹ گیا۔ وہ ڈبکی لگا کر اندر ہی اندر پانی کو کاٹتا ہوا رالو کے پاس آیا اور اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ رالو کے ہاتھ پاؤں رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ منہ پر کپڑا باندھا ہوا تھا۔ وہ ڈوبنے کی وجہ سے بدحواس ہو گئی تھی اور اپنی سانس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی ٹیوب ہچکولے کھاتے ہوئے دور چلے گئے تھے اور رالو اس قابل بھی نہیں تھی کہ پانی میں بغیر کسی سہارے کے کھڑی رہ سکتی۔ دوسری جانب کالے خان کو سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا اس نے دیوار کے ایک محرابی طاق میں رکھے ہوئے ہاتھ بھر کے ڈنڈے کو مضبوطی سے تھام لیا۔

ساجد ٹیوب کی جانب بڑھنے لگا تاکہ رالو کو اس پر ڈال دے۔ مگر اس سے پہلے

ہی کالے خان ٹیوب کے سامنے آگیا۔ اس نے ڈنڈے کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ ساجد جھکائی دیکر رابو سمیت اس سے ٹکرا گیا۔ وہ تینوں ہی پانی میں ڈوبتے چلے گئے ساجد نیوی فوج کا جوان تھا۔ وہ سمندر کی لہروں میں ڈوبنا اور ابھرنا اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے سامنے اس سیلاب کی کیا اہمیت تھی۔ سب سے پہلے وہی رابعہ کو لے کر پانی سے اُبھرا۔ ڈگمگاتا ہوا دیوار کی جانب گیا اور رابو کو اس دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا اسے اتنا موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ وہ رابو کو رسیوں سے آزاد کرا سکتا۔

کالے خان پھر سے سنبھل کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ ساجد غوطہ لگا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"ساجے! ــــ مرد ہے تو سامنے آ......"

کالے خان ڈنڈے کو اِدھر اُدھر پانی میں مارنے لگا۔ ساجے کو چیخ چیخ کر پکارنے لگا اور اس کی مردانگی کو للکارنے لگا۔ یک بیک ساجد پانی سے اُبھر کر اس کے بالکل سامنے آگیا۔ اس قدر سامنے آگیا کہ کالے خان کا ڈنڈے والا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ اُسے لیکر پانی کے اندر چلا گیا۔

رابو پریشانی سے دیکھنے لگی سیلاب کی گود میں بڑی زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دو مگرمچھ پھڑپھڑا رہے ہوں کبھی ان کی ٹانگیں نظر آتی تھیں اور کبھی ان کے سر اُبھرتے تھے۔ کالے خان پانی سے اُبھرنے کی کوشش کرتا تو ساجد پھر اسے لے ڈوبتا۔ پانی اتھل پتھل ہو رہا تھا اور اس کے چھینٹے رابو کو بھگوتے جا رہے تھے بڑی

ری لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

پھر ساجد پانی سے اُبھر کر کھڑا ہو گیا۔ اس بار ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"کالے خان! ــــ مرد ہے تو سامنے آ......"

کالے خان پانی سے اُبھرا اور بوکھلا کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ ساجد نے ڈنڈا اس کی طرف بڑھا دیا۔ کالے خان نے پہلے تو حیرت سے اُسے دیکھا پھر فوراً ہی اسے چھین کر حملہ کرنا چاہا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ میں آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی منہ پر ساجد کا گھونسہ پڑا اور وہ اُلٹ کر پانی میں چلا گیا۔

دوسری بار ہاتھ پاؤں مار کر وہ پھر اُبھرا۔ پھر ایک گھونسہ منہ پر پڑا اور وہ ڈبکیاں کھانے لگا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا لیکن اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ وہ ساجد پر حملہ کر سکتا۔ پانی میں سنبھلنا اور کھڑے رہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ بے دم سا ہو کر رہ گیا اور کسی طرح کھڑا رہنے کے لئے ہانپتے ہوئے آگے پیچھے جھولنے لگا۔ اس بار ساجد نے ڈنڈے کی جانب ہاتھ بڑھایا تو کالے خان نے خاموشی سے ڈنڈا اس کے حوالے کر دیا۔

"اب آرام کرو" ــــ ساجد نے کہا اور ڈنڈے کی ایک بھرپور ضرب اس کے سر پر لگا دی اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پانی میں گرتا ساجد نے اسے تھام کر اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور اسے لا کر ٹیوب کے اوپر

اوندھے منہ ڈال دیا۔

رالو بڑے ہی مضطربانہ انداز میں اس جنگ کو دیکھ رہی تھی۔ کالے خان کے بیہوش ہوتے ہی اس کی جان میں جان آئی۔ ساجد نے قریب آکر اس کے منہ سے کپڑا کی پٹی ہٹائی اور اس کے ہاتھوں کو کھول کر اسی رسّی سے کالے خان کے ہاتھ باندھ دیئے۔

رالو نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔ تم نہ آتے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔"

"تم ان بدمعاشوں کے ہاتھ کیسے آگئیں؟"

"میں اُوپری منزل سے اُتر کر نیچے آئی تھی کہ کسی طرح تمہیں ایک خطرے سے آگاہ کر دُوں۔"

ساجد نے گھوم کر اسے حیرت سے دیکھا۔ "خطرہ ـــــ کیسا خطرہ ـــ"

"یہ ـــ یہ جو سیلاب آیا ہے نا ـــ دراصل آیا نہیں لایا گیا ہے۔ میرے ابّا اور جناب علی نے اپنے باغات بچانے کیلئے اس کا رُخ اس طرف موڑ دیا ہے۔"

ساجد غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

تمہارا بنایا ہوا بند ٹوٹا نہیں بلکہ توڑا گیا ہے۔ وہ پولیٹیکل افسر اب تمہیں الزام میں گرفتار کرائے گا کہ تم نے اس کے کام میں دخل اندازی کی تھی جتنی جلدی سے وہ بنا رہا تھا اتنی مضبوطی سے تم نہیں بنا سکے اس لئے پنڈ میں سیلاب

ساجد کی مٹھیاں بھنچ گئیں غصہ سے دانت پر دانت جم گئے۔ رالو نے کہا۔

"نہ جانے اس سیلاب میں کتنے گھر تباہ ہو جائینگے۔ کتنی جانیں ضائع ہوں گی۔ جب میں نے یہ سنا کہ ساری تباہی کا ذمہ دار تمہیں بنایا جائیگا تو مجھ سے خاموش نہ رہا گیا نہ جانے کیوں تمہارے لئے میرے دل میں اتنا درد پیدا ہو گیا کہ میں رات کے اندھیرے میں اکیلی نچلی منزل میں آگئی تاکہ کسی کے ذریعے تمہیں اس خطرے سے آگاہ کر دُوں۔"

ساجد کو اب یاد آرہا تھا کہ جناب علی نے سیلاب سے ایک دن پہلے ہی اپنا تمام ضروری اور قیمتی سامان اوپری منزل میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے رالو سے کہا۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم نے نیکی اور انصاف کی خاطر باپ کے خلاف ہو کر مجھ سے ہمدردی کی ہے۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"میں نے تم پر احسان نہیں کیا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے دل سے مجبور ہو کر کیا ہے۔"

وہ سر جھکا کر یوں شرماتے ہوئے بولی کہ ساجد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ رالو کے گلابی رخساروں کی سرخی بتا رہی تھی کہ اس کا دل کس انداز میں ایک نوجوان کے لئے دھڑک رہا ہے۔ ساجد نے بڑی نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"رالو ـــ دل سے مجبور ہو کر نیکی کرنا اچھا ہے۔ مگر نیکی کے علاوہ کچھ اور سوچنا اچھا نہیں ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔

"دل کو لاکھ سمجھاؤ۔ وہ نہیں سمجھتا۔ میں نے بار بار خود کو سمجھایا کہ تم پرائے ہو۔

تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ میں نے یہ سوچ کر تم سے نفرت کرنے کی کوشش کی کہ تم
بے وفا ہو۔ کیونکہ تم نے شادو کو دھوکہ دیا ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا ساجد ـــ بلکہ
الٹی ضد کرتا ہے کہ جب تم ایک سے بیوفائی کر سکتے ہو۔ دوسری سے شادی کر سکتے
ہو تو تیسری کو بھی اپنے پیار کی تھوڑی سی خیرات دے سکتے ہو"۔

ساجد نے منہ پھیر کر کہا۔

میں نے شادو سے بے وفائی نہیں کی۔ حالات نے مجھے اس قدر بے بس کر
دیا تھا کہ میں ریشماں سے ـــ ریشماں سے ـــ نہیں، میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں
کہہ سکتا۔ ریشماں میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے۔ تم بس یقین کر لو کہ میں بیوفا نہیں ہوں

"کیسے یقین کر لوں"؟

"اس طرح یقین کر لو کہ میں سیلاب لانے کا مجرم نہیں ہوں لیکن مجرم کہلاؤں گا۔
ٹھیک اسی طرح میں نے شادو سے بے وفائی نہیں کی لیکن ہمیشہ بیوفا سمجھا جاتا رہوں گا"
ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو یقین کر لیتی ہوں۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے
کہ ریشماں سے شادی کرنے کے باوجود تمہارے دل میں شادو کی محبت باقی ہے۔"

ساجد گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں ـــ میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا"۔

وہ مسکرا کر بولی۔

"تم مجھے نادان لڑکی سمجھ کر بہلا رہے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم بیوفا بھی نہیں

ہو اور اس سے محبت بھی کرتے ہو"۔

وہ فوراً ہی بات بدل کر بولا۔

کیا ہم اسی طرح پانی میں کھڑے رہیں گے ـــ ٹھہرو۔ میں تمہارے پاؤں
کی رسیاں کھولتا ہوں"۔

وہ پانی میں ڈوب کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رابو نے اسے پانی کے اندر
اپنے پیروں کے قریب محسوس کیا۔ اس کے جسم میں عجیب سی گدگدی کا احساس ہونے
لگا یک بیک وہ سوچنے لگی کہ اگر پاؤں کھل گئے تو وہ ساجد کے زیادہ قریب آ سکے
گی۔ یہ سوچتے ہی وہ اچانک پانی میں گر پڑی۔

ساجد بوکھلا کر اسے پانی کے اندر سنبھالنے لگا۔ رابو اس بری طرح اس سے
لپٹ گئی جیسے ڈوبنے کی وجہ سے بدحواس ہو گئی ہو۔ ساجد بڑی مشکل سے اسے
لے کر پانی سے اُبھرا اور پھر اسے دیوار کے سہارے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیر سنبھلنے کی کوشش کرو۔ میں ابھی رسیاں کھول دیتا ہوں"۔

"نہیں" ـــ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "میں پھر گر جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے"۔

بدپریشان ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ شجر ممنوعہ کی طرح سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ بار بار
انی میں ڈوبنے کی وجہ سے اس کا لباس بھیگ کر بدن سے ایسے چپک گیا تھا کہ
م کی ایک ایک باریکی نمایاں ہو گئی تھی۔ پہلے ساجد نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ
ہیں دی تھی لیکن اب اس سے محتاط ہوتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ آگ ہے اور

کسی وقت بھی ریشماں کی طرح اسے لپیٹ میں لے سکتی ہے۔

مجبوری یہ تھی کہ وہ رابو سے کوئی سخت بات بھی نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ سیلاب کے سلسلہ میں مقدمہ کے وقت یہ لڑکی اس کی بے گناہی کی ایک اہم گواہ بن سکتی تھی۔ اپنے مجرم باپ کے خلاف اس کی حمایت کر سکتی تھی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا رابو پاؤں کی رسیاں کھولنے سے روک رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ا
گود میں اٹھا کر لے جائے۔

" کیا سوچ رہے ہو؟" رابو نے پوچھا۔ کیا میں اسی طرح پانی میں کھڑی رہوں؟

ساجد نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ رابو اس کی گردن میں باہیں ڈال کر اس سے اس طرح لپٹ گئی کہ چھاتی پر چھاتی دھڑکنے لگی۔ ساجد اسے اوپری منزل کی طرف لے جانے لگا۔ وہ بڑے پیار سے بولی۔

" ساجد! تمہاری باتوں سے میں سمجھ گئی ہوں کہ تم شادو کو نہیں بھولے۔ اس لئے کہ تم دل سے مجبور ہو۔ یہی بات میں بھی تمہیں سمجھا رہی تھی کہ میں بھی دل سے ہوں۔ یہ دل جو صرف تمہارے لئے دھڑک رہا ہے تو کیا تم اس دھڑکن کو روک سکتے

ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر اسی کمرے میں آیا جہاں رابو قید تھی۔ اس نے پلنگ پر اسے ڈال کر اپنی گردن سے اس باہیں الگ کر دیں اور پھر اس کے پیروں کی رسیاں کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

" اس کمرے کو پہچانتی ہو۔ یہاں کچھ دیر پہلے تم قید تھی۔ یہاں کچھ دیر پہلے

پ تمہارے لئے آنسو بہا رہا تھا۔ بیٹی کی عزت خطرے میں پڑ جائے تو باپ کیوں نہ روتا۔ جانتی ہو۔۔؟ نہیں جانتی۔ اگر جانتی تو اس طرح میرے گلے نہ پڑتی۔ تم جوان ہو۔ خوبصورت ہو۔ یہ شعلوں کی طرح گرماتا ہوا بدن کسی کو بھی گناہ کے لئے مجبور کر سکتا ہے لیکن میں کس طرح مجبور ہو جاؤں؟ جن آنکھوں سے میں تمہاری جوانی دیکھ رہا ہوں ان آنکھوں سے میں نے تمہارے بوڑھے باپ کے آنسو بھی دیکھے ہیں۔ جن کانوں سے میں نے تمہاری گناہ آلود باتیں سُنی ہیں انہی کانوں سے میں نے اپنی ماں کے نے بھی سُنے ہیں کہ میں پرائی بہو بیٹیوں کی عزت نہیں کر سکتا۔ میں کر سکتا ہوں۔ تمہاری بھی عزت کر رہا ہوں۔ خدا کیلئے سوچو کہ عزت کتنی مہنگی چیز ہے۔ تم خود کہہ چکی ہو کہ اگر میں تمہیں نہ بچاتا تو تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتیں۔"

وہ یک بیک دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی پھر سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔

" تم ٹھیک کہتے ہو کہ عزت مہنگی چیز ہے لیکن میں بھی غلط نہیں کہتی۔ زندگی میں کسی کو عزت کا مالک بنانا ہی پڑتا ہے۔ وہ میں نے تمہیں بنا لیا۔ میں بہت ضدی ہے ساجد۔ میں بہت ضدی ہوں۔ اب میں کسی کے اتنے قریب نہیں جاؤں گی تمہارے قریب آ چکی ہوں۔ اگر ماں باپ نے زبردستی میری شادی کسی دوسرے نی چاہی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

" پاگلوں کی طرح باتیں نہ کرو"۔۔۔۔ وہ جھلا کر بولا۔" سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جیسی ن مند لڑکیاں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں۔ جیسے دولت سے نہیں خرید سکتیں اسے

کبھی مکاری سے خریدتی ہیں اور کبھی آنسو بہا کر حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ میں جناب علی کی حویلی میں ایک زخم کھا چکا ہوں رابو۔ دوسرا زخم تم لگانا چاہتی ہو۔ لیکن میں بار بار دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ میں اب تک تمہیں اس لئے نرمی سے سمجھاتا رہا کہ تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ سیلاب کے سلسلے میں اگر مجھ پر الزام لگا تو میں نے سوچا کہ تم اپنے باپ کے خلاف میری حمایت بھی کر سکتی ہو۔ لیکن میں تمہاری گواہی اور تمہاری نیکی کی قیمت نہیں دے سکتا۔ مجھے تمہاری دشمنی منظور ہے مگر دوستی منظور نہیں ہے

وہ یک بیک بپھر کر بولی۔

"تم ــ تم میری توہین کر رہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ میں اس توہین کا بدلہ بھی لے سکتی ہوں۔ عورت پیار کرنے پر آئے تو موم کی طرح پگھل جاتی ہے اور انتقام لینے پر آئے تو ناگن بن کر ڈس لیتی ہے۔"

"مجھے تجربہ ہے کہ عورت کس طرح ڈستی ہے لیکن میں نے ایک عورت کا پیار بھی دیکھا ہے کہ وہ کس طرح خاموشی سے میری بے وفائی کے باوجود محبت کا ہاتھ رکھتی ہے اور مر مر کر جیتی ہے۔ تم جس محبت کا اظہار کر رہی ہو وہ محبت نہیں ہے ہوس ہے۔ ایک مرد کو حاصل کرنے کا لالچ ہے۔ ریشماں اور تم اور تمہارے جیسی لڑکیاں اپنی خوبصورتی سے لبھا سکتی ہیں۔ اپنے جسم کی سوغات پیش کر سکتی ہیں

• میرے دل میں وہ محبت اور تڑپ پیدا نہیں کر سکتیں جو شاد کے نام سے پیدا ہوتی

میرے پیار کی ابتدا شاد ہے۔ میرے پیار کی انتہا شاد ہے۔"

رابو نے منہ پھیر کر کہا۔

"تم اپنے پیار کی انتہا نہ بتاؤ۔ میرے پیار کی بھی انتہا دیکھو کہ زندگی میں پہلی بار محبت کی ہے ــ تم سے محبت کی ہے ــ تڑپنا اور سسکنا شاد جیسی غریب لڑکیوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ ریشماں اگر تمہیں جبراً حاصل کر سکتی ہے تو میں بھی تمہیں حاصل کر دوں گی ــ اگر بدنام ہو کر بھی تمہارے نام کے ساتھ میرا نام آتا ہے تو میں یہ بدنامی اور رسوائی بھی قبول کر لوں گی۔"

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔"

"یہ بکواس نہیں ــ جو کہہ رہی ہوں پورے ہوش و حواس سے کہہ رہی ہوں۔ یاد رکھو ــ میرے اغوا کے سلسلے میں بات پنچوں تک پہنچ گئی تو میں ایسا بیان دوں گی کہ جناب علی کی بجائے تم مجرم بن جاؤ گے۔"

ساجد غصے کی آگ میں کھولنے لگا۔

"میں ــ میں تمہارے ٹکڑے کر کے پھینک دوں گا۔"

رابو نے سینے پہ دونوں ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری خوش نصیبی ہو گی ــ تمہارے ہاتھوں جی نہیں سکتی، مر تو سکتی ہوں ــ یہی میرے پیار کی انتہا ہے۔"

ساجد دانت پیستے ہوئے بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اگر قانون کا محافظ نہ ہوتا تو اسے ضرور قتل کر دیتا۔ آنے والا وقت اس کے لئے بدنامی کے

دروازے کھول رہا تھا۔ شادو کا اعتماد اور زیادہ ڈگمگا جاتا۔ ماں اور شدت سے نفرت کرنے لگتی۔ جناب علی تو دشمن ہو ہی چکا تھا۔ چودھری بھی دشمن بن جاتا۔ اس پنڈ میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اس کی شرافت شناسی کا یقین کرتا۔

وہ لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے لگ گیا اور بڑے دکھ سے سوچنے لگا۔ "میں کس وطن کا سپاہی ہوں ـــــ ؟ کن بہو بیٹیوں کے لئے اپنے جسم پر زخموں کو سجاتا ہوں ـــــ ؟ میں سرحد کو مضبوط بنا کر آتا ہوں تو میرے لوگ اس زمین کو سیلاب میں ڈبو دیتے ہیں ـــــ سپاہی تنہا کوئی بھی جنگ نہیں جیت سکتا ـــــ اندر کمزوریاں ہوں تو وہ سرحد کے باہر تک چلی آتی ہیں ـــــ دشمن اپنے ہتھیاروں سے نہیں، ہماری کمزوریوں سے جنگ جیت لیتا ہے اور ہم دن بدن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں ـــــ عورتوں کو ہوس اور مردوں کو دولت کا لالچ بے نیم بنا رہا ہے ـــــ ایمانداری اور یک جہتی کہیں نہیں ہے۔ لیکن میں ـــــ میں پھر بھی بے ایمانی نہیں کر سکتا ـــــ خدا مجھے آزما رہا ہے۔ میں خدا کو آزماؤں گا کہ وہ ایمانداروں کو نیکیوں کا کیا بدلہ دیتا ہے۔"

اس نے ایک نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ کہا۔

"رابو ـــــ چلو۔ بہت وقت گزر چکا ہے۔ اتنا وقت گزر چکا ہے کہ تم مجھے بدنام کرنے کے لئے ہزار طرح کی کہانیاں بنا سکتی ہو ـــــ لوگ تمہاری کسی بھی کہانی پر یقین کر لیں گے۔ لیکن مجھے خدا کی ذات پر یقین ہے۔ آؤ ـــــ یہ

کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

رابو نے دانت پیستے ہوئے اس دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے ماجد گزر کر باہر گیا تھا۔ وہ اسے ٹھکرا کر گیا تھا۔ اپنی توہین کے احساس سے وہ کانپنے لگی۔ اس نے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی مٹھی میں اپنے گریبان کو سختی سے بھینچ لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے نوچ ڈالا۔

وہ پھٹا ہوا گریبان اس کی بنائی ہوئی کہانی کا پیش لفظ بھی ہو سکتا تھا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ
پرانا شکاری بھی ساری زندگی شکار
کھیلتے کھیلتے خود ایک دن شکار
ہو جاتا ہے۔

جناب علی شطرنج کا منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ وہ ہارتی ہوئی بازی کو جیتنے کے لئے کوئی نہ کوئی کارآمد مہرہ بچا کر رکھتا تھا۔

اور وہ کارآمد مہرہ تھا برکتے ـــــ برکت علی اس کا سالا بھی تھا اور اس کے ٹکڑوں پر پلنے والا سانڈ بھی۔ وہ جناب علی کے دشمنوں کو سینگ مارنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی ایک عیاش آدمی ہے اور اپنے مہمان خانہ کو عزت کدہ بنائے رکھتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی بدکردار ہونے کے باوجود اس کی بہن پر کوئی دوسری سوکن نہیں لاتا۔ وہ گھر کے اندر ایک شریف خاوند ہے۔ باہر جیسا بھی ہو۔ جہاں دولت ہوتی ہے وہاں دولت کی ایسی تیسی اسی طرح ہوتی ہے۔

اس لئے وہ جناب علی کے لئے جان کی بازی لگا دیتا تھا۔ جس وقت چودھری

اپنی بیٹی کے لئے حویلی کی تلاشی لے رہا تھا۔ اسی وقت جناب علی نے برکتے کو سمجھا دیا تھا کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ اگر کالے خان رالو کو چھپانے میں ناکام رہا تو ساجد نے انہیں قانونی گرفت میں لینے کی کوشش کی تو انہیں بھی کھل کر ساجد سے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ ریشماں کی وجہ سے رشتہ داری کا لحاظ کرے یا پھر ہمیشہ کے لئے دشمن بن جائے۔

اس کے حکم کے مطابق برکتے نے چپکے ہی چپکے محاذ قائم کر لیا تھا۔

چودھری فضل دین ان کی سازشوں سے بے خبر مہمان خانے سے واپس آ رہا تھا۔ جناب علی اور اس کا ملازم مجرموں کی طرح سر جھکائے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے دو نوجوان انہیں دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھا رہے تھے۔

چودھری چھتوں کی طرف دیکھتا ہوا لوگوں سے کہتا جا رہا تھا۔

"دیکھو — یہ تمہارے پنڈ کا جناب علی کتنا کمینہ ہے — میری رالو کو اغوا کے آدمی اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"کہاں ہے رالو —؟" عورتیں چھتوں پر سے پوچھنے لگیں۔

"آ رہی ہے — ساجے اسے لے کر ابھی آئے گا۔"

"ارے جناب علی — لعنت ہے تجھ پہ — یہاں خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے اور تم اپنی بیٹیوں کو میلی نظر سے دیکھ رہے ہو۔"

"رالو پہ کوئی آنچ تو نہیں آئی؟"

"نہیں موسی" — چودھری نے جواب دیا — "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جہاں ساجے جیسا دیانتدار سپاہی ہو۔ وہاں کی بہو بیٹیوں پر ذرا بھی آنچ نہیں آ سکتی۔"

مائی خیراں کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

اسی وقت برکتے کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"رک جا چودھری۔"

سب نے حویلی کی جانب دیکھا۔ برکتے حویلی کے گیٹ پر رائفل تانے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"جناب علی مجرم نہیں ہے — وہ تیری بیٹی کو گھر سے اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ جو لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے تو ان کے خلاف کارروائی کر سکتا ہے لیکن جناب علی کو بدنام نہیں کر سکتا۔"

چودھری نے کہا۔

"جو کارروائی کرنی ہے۔ وہ ساجے کرے گا۔ تو رائفل دکھا کر دھمکی نہ دے۔"

"یہ دھمکی تیری موت بھی بن سکتی ہے۔ ذرا اپنے چاروں طرف دیکھ۔ میرے ایک اشارے پر تیری لاش پانی میں بہہ جائے گی۔"

چودھری کے ساتھ دونوں نوجوانوں نے بھی نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ایک آدمی حویلی کی چھت پر رائفل لئے کھڑا تھا۔ باقی تین آدمی تین مختلف چھتوں پر مسلح کھڑے

ہوئے تھے۔

جناب علی اپنے ملازم کے ساتھ بڑی شان سے چلتا ہوا حویلی کے گیٹ پر آکر کھڑا ہو گیا۔

چودھری نے غصّے سے کہا۔

"تو کیا سمجھتا ہے مجھے اس طرح گھیرنے کے بعد کیا تُو قانون کے ہاتھوں سے بچ جائے گا"۔

جناب علی نے بلند آواز سے کہا۔

"چودھری زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر ـــــ تُو اپنے جرم کو چھپانے کے لئے لوگوں کے سامنے مظلوم بن رہا ہے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تُو نے بھی ایک لڑکی کو اغوا کیا ہے اور وہ لڑکی ہے کرم دین کی بیٹی ناصرہ"۔

اس انکشاف پر تمام لوگ چودھری کو گھورنے لگے۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہا ہے ـــــ تم لوگ اس کی باتوں میں نہ آؤ"۔

جناب علی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اگر یہ جھوٹ ہے تو بتا کہ تیرا لڑکا کہاں ہے"؟

"وہ پرانے مکان میں ہے"۔

کیا خوب ـــــ یہاں زبردست سیلاب آیا ہوا ہے اور تمہارا بیٹا بوڑھے

ماں باپ کو چھوڑ کر پرانے مکان میں رہتا ہے۔ یہاں بہن کو اغوا کیا گیا اور بھائی اب تک اس کی خبر نہ ہوئی ـــــ خبر ہوگی کیسے ـــــ اُسے تو شراب اور لڑکی کے نشے نے مدہوش کر رکھا ہوگا"۔

اپاہج کرم دین نے اپنی چھت پر سے چیخ کر کہا۔

"ادئے چودھری! ـــــ اگر حمیدے نے میری بیٹی کی زندگی برباد کی تو تجھ پر خدا کی ایسی مار پڑے گی کہ تیرا سارا خاندان تباہ ہو جائے گا ـــــ تُو بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا"۔

چودھری بگڑ کر بولا۔

"بکواس نہ کر کرم دینے ـــــ میرا حمیدے، جناب علی کی طرح کمینہ نہیں ہے"۔

"کمینہ کون ہے۔ یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی یہاں سے کچھ لوگ پرانے مکان کی تلاشی لینے جائیں گے"۔

چھتوں پر سے چند لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہاں ہاں ـــــ ہم ضرور تلاشی لیں گے"۔

چودھری پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ وہ اپنے بیٹے کی بُری عادتوں سے واقف تھا اور کل سے پریشان تھا کہ حمیدے پرانے مکان سے واپس کیوں نہیں آیا ہے؟ اب جناب علی کی باتیں سُن کر اسے بھی شبہ ہو گیا تھا کہ ناصرہ کو غائب کرنے میں کہیں حمیدے کا ہاتھ نہ ہو۔

اس گلی کے چار آدمی اپنی اپنی چھتوں پر سے اُتر آتے تھے اور جناب علی کے دو مسلح آدمیوں کے ساتھ پرانے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ برکتے نے آگے بڑھ کر چودھری کے سینے پر رائفل کی نال رکھتے ہوئے کہا۔

"جب تک حمیدے کی بے گناہی ثابت نہ ہو۔ اس وقت تک تُو ہماری حراست میں رہے گا۔"

کوٹھی کی چھت پر کھڑی چودھرانی اپنی چھاتی پیٹ کر چیخنے لگی۔

"ہائے ہائے لوگو ـــ یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے۔ یہ بدمعاش پہلے میری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔ پھر بیٹے کو پکڑنے چلے گئے اور اب میرے خاوند پر ظلم کر رہے ہیں۔ کیا یہاں کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔"

مائی خیراں نے کہا۔

"جناب علی! ـــ کسی کو حراست میں رکھنے کا تجھے کوئی حق نہیں پہنچتا ـــ چودھری کو چھوڑ دے۔ اس کا فیصلہ ساجے کرے گا۔"

"چُپ رہ بڑھیا۔" جناب علی نے غصّہ سے کہا ـــ "یہ دیکھ تیرے بیٹے نے میرا سر پھوڑ کر لہولہان کر دیا ہے ـــ میں اس کا بدلہ لیکر رہوں گا۔ آج تو اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا ـــ بلا سے میری بیٹی بیوہ ہو جاتے۔ میں ایسے داماد کے رشتہ پر تھوکتا ہوں۔"

مائی خیراں نے ہاتھ نچا کر کہا ـــ "ارے تھوکنا ہے تو اپنی بیٹی پر تھوکو

اس کی ذلیل حرکتوں کی وجہ سے میرا بیٹا تیرا داماد بننے پر مجبور ہو گیا۔"

"بکواس مت کر بڑھیا ـــ میں چاہوں تو ابھی ایک ہی گولی سے تجھے ٹھنڈا کر دوں۔ لیکن میں تجھے زندہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ تُو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بیٹے کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھے۔"

شادو تڑپ کر مائی خیراں کے پاس آئی اور اُسے جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔

"ماں جی! ساجے کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُسے یہاں آنے سے کسی طرح روکو۔"

مائی خیراں بھی بدحواس ہو گئی تھی۔ ساجد کسی وقت بھی رالو کے ساتھ یہاں آنے والا تھا۔ اُسے اطلاع دینے کے لئے وہ نیچے گلی سے گزر کر جا بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ وہاں جناب علی اور اس کے آدمیوں کا پہرہ تھا۔

یک بیک شادو دوڑتی ہوئی کرم دین کی چھت کی جانب آئی اور ناصرہ کی ماں سے بولی۔

"ماسی ـــ لوگوں سے کہہ دے کہ وہ ایک چھت سے دوسری چھتوں تک خبر پہنچا دیں کہ ساجے خطرے میں ہے۔ اسے اس گلی میں نہ آنے دیں۔"

ناصرہ کی ماں نے کہا۔

"نہیں شادو ـــ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ جناب علی میرے ساتھ نیکی کر رہا ہے پہلا آدمی ہے جسے میری بیٹی کا خیال آیا ہے۔ اس کے حکم پہ لوگ میری بیٹی کو

تلاش کرنے گئے ہیں۔ میں جناب علی سے دشمنی نہیں کر سکتی"۔
شادو مایوس ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ دُور ایک چھت پر سے ایک نوجوا
نے کہا۔
"شادو ـــ میں نے تیرا پیغام سُن لیا ہے۔ گھبرا مت ـــــ یہ پیغام آگے
بڑھے گا"ـــــ اس نوجوان نے اپنے آگے والی چھت پر پیغام بھیج دیا
آگے والوں نے آگے ـــ اور آگے والوں نے آگے تک شادو کی آواز پہنچا
جناب علی پریشانی سے سوچتا ہی رہ گیا۔ شادو کی آواز ایک چھت۔
دوسری چھت تک اُڑتی ہوتی بہت دُور چلی گئی تھی۔

ناصرہ کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ صرف آنسو رہ گئے تھے۔ وہ پچھلی رات سے
روتی رہی تھی۔
لیکن کب تک روتی رہتی۔ صیاد کو رحم نہ آئے تو آنسو یونہی ضائع جاتے ہیں۔
چودھری کے بیٹے کے لئے غریب لڑکیاں یوں بھی ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت
نہیں رکھتی تھیں۔ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ شادو ہاتھ آجائے تو وہ ناصرہ کو ہمیشہ کے
لئے کہیں غائب کر دیگا لیکن پچھلی رات اس کے آدمی شادو کو حاصل کرنے میں ناکام
رہے تھے۔ آس پاس کی تمام چھتوں پر لوگ تمام رات جاگتے رہے تھے اس لئے شادو
تک پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر حمیدے نے سوچا کہ ناصرہ سے دل بھر جائے تو وہ اس
کو بھی چھوڑ دے گا۔ رات گزر گئی۔ صبح ہو گئی۔ اس نے رات کی نیم تاریکی میں بھی
اسے دیکھا اور دن کے اُجالے میں بھی اسے دیکھتا اور پرکھتا رہا۔ مگر کچھ عجیب سی
بات تھی کہ وہ لڑکی اسے ہر بار ایک نئی لڑکی نظر آئی۔ ہر بار اسے ایک نیا لگاؤ پیدا

ہوتا گیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پرانا شکاری بھی ساری زندگی شکار کھیلتے کھیلتے خود ایک دن شکار ہو جاتا ہے۔

حمیدے کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ وہ ناصرہ کے جتنے قریب ہوتا گیا اُتنا ہی زیادہ اُلجھتا گیا۔ اسے ہوس نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ ہوس وقتی چیز ہوتی ہے۔ ہانڈی کے اُبال کی طرح اٹھتی ہے اور پھر بیٹھ جاتی ہے۔ ناصرہ کے ساتھ کچھ اور ہی بات تھی۔ وہ ایک نامعلوم خوشبو کی طرح حمیدے کے ذہن کو چھو رہی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس پھول کو سونگھ سکتا ہے لیکن مسل کر پھینک نہیں سکتا۔

وہ پلنگ پر خاموش پڑی ہوئی اداس نظروں سے چھت کو تکے جا رہی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے خشک ہو گئی تھیں اس پر جو گزرنی تھی وہ گزر چکی تھی۔ اس لئے اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور رونا دھونا چھوڑ کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

حمیدے نے اس کے قریب انڈے اور پراٹھے کی پلیٹیں رکھتے ہوئے کہا۔

”آؤ ناشتہ کر لو۔“

وہ خاموشی سے اسی طرح چھت کو تکتی رہی۔ حمیدے نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ خیالات سے چونک گئی اور خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ اس بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھیں ایسی تھیں کہ سیدھی دل میں اترتی جاتی تھیں۔ حمیدے ا پر جھک گیا۔ ناصرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بڑے پیار سے ان آنکھوں کو چومنے لگا

”اٹھو ——— ناشتہ کر لو۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے۔؟“

”جو مر جاتے ہیں انہیں بھوک نہیں لگتی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”جو کچھ ہو رہا ہے اس پر افسوس نہ کرو۔“

”نہ بھوک لگتی ہے۔ نہ نیند آتی ہے اور نہ ہی کسی بات کا افسوس ہوتا ہے۔

ی فکر نہ کرو۔ صرف اتنا بتا دو کہ اور کب تک یہ سزا کاٹنی ہوگی۔“

”تم اسے سزا سمجھ رہی ہو۔؟“

”پھر کیا سمجھوں۔؟“

”محبت ——— میں تو تم سے محبت کر رہا ہوں۔“

”کسی کو لوٹنے کا نام محبت ہے تو پھر محبت ہی سہی۔ یہ کھیل کب ختم ہوگا؟

وہ ایک گہری سانس لینے کے بعد کہنے لگا۔

”یہ کھیل ہوتا تو کب کا ختم ہو جاتا۔ میں ایک بار کھلونے سے کھیلتا ہوں۔ پھر اُسے نہیں دیکھتا۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ تمہیں بار بار سینے سے لگانے کو جی چاہتا ہے“ ——— یہ کہتے ہوئے اس نے ناصرہ کو سینے سے لگا لیا۔

ناصرہ! ——— میں نے اب سے پہلے ایک نہیں سینکڑوں بار تمہیں دیکھا ہے ہمارے لئے کبھی ایسی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ریشماں میرے ذہن

پر چھاتی ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ خوبصو
صرف ریشماں کی جاگیر نہیں ہے۔ تمہیں حاصل کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ عورت میں
اور بھی بہت سی خوبصورتی اور خوبیاں ہوتی ہیں جو مجھ جیسے بے فکرے کو بھی سوچنے
پر مجبور کر دیتی ہیں۔"

"تم اتنی خوبصورتی سے مجھے نہ بہلاؤ۔ خود کو جتنی دیر بہلا سکتے ہو بہلاؤ۔
اس کے بعد مجھے آزاد کر دینا۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آزاد ہو کر واپس پنڈ میں جاؤ گی اور مجھے بدنام کرو گی۔"

وہ بڑے کرب سے بولی ـــ "بدنام تو وہ کرتے ہیں جو نیک نام ہوتے ہیں
میرے پاس اب نیک نامی کہاں رہی ہے۔ میں تو اس دنیا سے دور چلی جاؤں گی
تاکہ کوئی میرے چہرے کی سیاہی نہ دیکھ سکے۔"

"تمہاری یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"میں اور میری باتیں اچھی نہ لگیں تو تم کیا بگاڑ لو گے ـــ؟ کیا بگاڑنے
لئے کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

حمیدے نے اس کے گلابی ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی۔ پھر اس
مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم جتنی میٹھی ہو، تمہاری باتیں اتنی ہی کڑوی ہیں۔ بس اب چلی کٹا

نہ کرنا ـــ آدھا ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

وہ ناصرہ سے الگ ہو کر ناشتہ کی پلیٹ اٹھانے لگا۔ اسی وقت چھت
پر سے ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔

"چھوٹے سرکار ـــ خطرہ ہے۔ کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔"

حمیدے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ فوراً ہی دیوار کے پاس آیا اور وہاں ایک کیل
سے لٹکی ہوئی رائفل کو لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

آنے والے تعداد میں چھ تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں کے پاس رائفلیں
تھیں۔ وہ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھے اور پانی میں بمشکل چلتے ہوئے اس
فاصلے کو کم کرتے آ رہے تھے۔ حمیدے نے ان رائفل برداروں کو پہچان لیا۔ وہ دونوں
جناب علی کے آدمی تھے۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"جہاں ہو۔ وہیں رک جاؤ اور یہاں آنے کی وجہ بتاؤ۔"

اُن میں سے ایک نے جواب دیا۔

"ہم تمہارے مکان کی تلاشی لیں گے ـــ جناب علی کہتا ہے کہ تم کرم دین
کی بیٹی ناصرہ کو اٹھا کر لائے ہو۔"

حمیدے نے بگڑ کر کہا۔

"چلے جاؤ یہاں سے ـــ یہاں کسی کی بیٹی نہیں ہے۔"

ناصرہ کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ بولی ـــ "تم ٹھیک

کہتے ہو ـــــ میں اب کسی غیرت مند کی بیٹی نہیں رہی۔"

" بکواس مت کرو" ـــــ وہ جھلا کر بولا۔

باہر سے ایک آدمی نے کہا۔

" حمیدے! ـــــ اگر تیرے مکان میں کوئی نہیں ہے تو پھر ایک شریف آدمی کی طرح ہمیں تلاشی لینے دے۔"

" نہیں ـــ یہ کسی چور اُچکے کا مکان نہیں ہے کہ تم لوگ تلاشی لوگے دُور ہو جاؤ یہاں سے" ـــــ یہ کہتے ہوتے اس نے فائر کر دیا۔ بُلٹ ان کے قریب ہی پانی میں چھپاک سے آکر گرا اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ وہ سب کھُلی جگہ میں تھے۔ حمیدے اور اس کے آدمیوں پر وہ جوابی فائر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ پسپا ہو کر دُور جانے لگے۔ ایک نے چیخ کر کہا۔

" حمیدے! ـــ تیری اس حرکت نے ہمارے شبہ کو یقین میں بدل دیا ہے۔ مگر یاد رکھو۔ پچھلی رات دو لڑکیاں غائب ہوئی ہیں جن میں سے ایک تیری بہن رابو بھی ہے۔"

حمیدے کے ہاتھ سے رائفل چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی ـــــ " یہ جھوٹ ہے میری بہن کو میلی آنکھ سے دیکھنے والا ابھی کوئی پیدا نہیں ہوا ہے۔"

" اتنا غرور نہ کر حمیدے! ـــــ اگر ساجے تیری بہن کو نہ بچاتا تو تُو اور تیرا چودھری باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے"۔

جناب علی کے ایک آدمی نے کہا ـــــ " ساجے نے تیری بہن کی خاطر جناب علی سے دشمنی کی ہے۔ لیکن یہ دشمنی تم سب کو مہنگی پڑے گی۔ اگر ناصرہ واپس نہ ملی تو ہم رابو کو پھر اٹھا کر لے جائیں گے۔"

حمیدے نے غصّہ سے تلملا کر پھر فائر کیا۔ وہ پانی میں گرتے پڑتے بھاگنے لگے۔ حمیدے غصّہ اور جھنجھلاہٹ سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پے در پے فائر کرتا جا رہا تھا۔ جب تک وہ نظر آتے رہے۔ یہ اپنے کارتوس کی پیٹی خالی کرتا رہا۔ اس کی بہن پر کوئی ہاتھ ڈالے۔ یہ اس کے لئے ڈوب مرنے کی بات تھی۔ وہ غصّہ کے مارے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے فرش کا سینہ دہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بہن کی حفاظت کے لئے اسے پنڈ واپس جانا چاہیئے لیکن وہ واپس کس طرح جاتا۔ اس نے اپنے مکان کی تلاشی کے لئے اجازت نہیں دی تھی۔ پنڈ والوں کو یقین ہو جائے گا کہ ناصرہ یہاں چھپائی گئی ہے۔ اگر وہ مجرم کی حیثیت سے جائے گا تو ساجے اور تھانیدار اسے گرفتار کر لیں گے۔ اس نے غصّہ سے ناصرہ کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر رائفل کو فرش پر پٹختے ہوئے بولا۔

" میں تمہاری وجہ سے پنڈ میں نہیں جا سکتا۔ تم میرے لئے مصیبت بن گئی ہو۔"

ناصرہ نے تلخی سے کہا ـــ " میں نے کب کہا تھا کہ مجھے مصیبت بنا کر یہاں لاؤ۔"

" بکواس مت کرو" ـــــ وہ غرا کر اس کی طرف بڑھا۔

" بہن کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے تو کس طرح غرا رہے ہو۔"

تڑاخ سے ناصرہ کے منہ پر طمانچہ پڑا اور وہ بستر پر گر پڑی۔

"میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا"

وہ کروٹ بدل کر مسکرائی اور اپنے گال کو سہلاتی ہوئی بولی۔

"ساجے نہ جانے کتنی دیر میں رالو کو بچانے کے لیے پہنچا ہو گا۔ اس وقت تک رالو کے منہ پر بھی ایسے ہی طمانچے پڑے ہوں گے۔"

"سوّر کی بچی۔ چپ ہو جا" ــــ اس نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی۔

"میں تیرا گلا گھونٹ کر پانی میں پھینک دوں گا۔ کسی کو تیری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

وہ اس کا گلا گھونٹنے لگا۔

ناصرہ کے دیدے پھیل گئے۔ وہ آنکھیں جو سیدھی حمیدے کے دل میں اترتی تھیں اب اس کی آنکھوں کو گھورنے لگیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ کمزور پڑنے لگے۔ وہ ذرا سست پڑنے لگا تو ناصرہ نے اٹکتی ہوئی سانسوں میں کہا۔

"ساجے ــ اگر ــ اگر نہ بچاتا تو ــ کوئی رالو کا گلا بھی اسی طرح گھونٹ دیتا۔ تمہاری بہن پر آنچ نہیں آئی۔ آؤ اسی خوشی میں کسی غریب کی بیٹی اور بہن کو مار ڈالو۔"

حمیدے کے دونوں ہاتھ خالی رائفل کی طرح بیکار ہو گئے۔ وہ بے دم ہو کر ناصرہ پر گر پڑا اور اس کے سینے پر سر رکھ کر کسی زخمی شیر کی طرح کراہنے لگا۔ وہ بہادر تھا۔ غیرت مند تھا سب کچھ تھا۔ وہ ابھی یہاں سے جا کر اپنی بہن کی توہین کا بدلہ لے سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنی غلطی کی تلافی کر رہا تھا اور ناصرہ کے سینے پر سر رکھ کر کراہتے ہوئے

کہہ رہا تھا۔

"جاگیردار کی بیٹی ہو یا کرم دین اپاہج کی بیٹی۔ سب کی عزت ایک جیسی ہوتی ہے۔"

ناصرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بڑے دکھ سے بولی۔

"آج تمہارے دل پر یہ زخم نہ لگتا تو تمہیں پرائی عزّت کا خیال تک نہ آتا۔"

"ہاں ناصرہ ــ میں نے تمہارا گلا دبایا تو مجھے یوں لگا جیسے رالو کے ساتھ بھی کہیں ایسا ہی سلوک ہوتا رہا ہے ــ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے تکلیف پہنچی ہے تو میں تمہاری تکلیف کو سمجھنے لگا ہوں۔"

بڑی دیر کے بعد ناصرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ظلم کرنے والا پچھتا رہا تھا۔ ظلم سہنے والی رو رہی تھی۔

حمیدے کا سر اب تک اس کے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھا تھا۔ شاید وہ شرمندگی کی وجہ سے سر اٹھا کر آنکھیں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ ناصرہ چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کو سہلانے لگی۔ اس کے بالوں کو سلجھاتی ہوئی اپنی انگلیوں کو الجھانے لگی۔

کمرہ خاموش ہو گیا تھا۔ کھڑکی کے باہر دھوپ تیز ہو گئی تھی اور نیچے سیلاب کی لہریں دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر رو رہی تھیں۔

ایک طرف غیرت کا سوال تھا کہ بیٹی اغوا کی گئی تھی۔ دوسری طرف عزت کا سوال تھا کہ بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ زیادہ عزیز بیٹا ہے یا بیٹی۔

چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ مگر لوگ پانی پینے کے لئے ترس رہے تھے۔ کیونکہ چھت کے نیچے جو پانی بہہ رہا تھا وہ گدلا تھا۔ اس سیلاب میں انسانی آبادی کی ایسی ایسی غلاظتیں بھی بہتی تھیں جنہیں دیکھ کر اُبکائی سی آنے لگتی تھی۔

سیلاب کا دوسرا دن تھا۔ اس لئے لوگ پیاس کو برداشت کر رہے تھے۔ لیکن بچوں کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ پانی کو گرم کر کے استعمال کے قابل بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن بہت سی چھتوں پر آگ جلانے کا سامان بھی نہیں تھا۔ جن لوگوں کے پاس تھوڑی بہت لکڑیاں اور گوبر کے کنڈے تھے۔ وہ

انہیں صرف ایک وقت تھوڑا سا جلا کر زیادہ سے زیادہ روٹیاں پکا لینے کی کوشش کرتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے دھوپ ڈھل گئی تھی اور بادل گھر کر آنے لگے۔ چھتوں پر رہنے والوں کے لئے پہلے دھوپ کی شدت وبال جان بن گئی تھی اب بارش کے آثار دیکھ کر گھبرانے لگے۔

جناب علی کی حالت بھی غیر تھی۔ سیلاب سے زیادہ ساجد اس کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ وہ اور اس کے آدمی صبح سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ رابو کو لے کر یہاں آئے گا تو اسے گھیر کر اپنی توہین کا انتقام لیا جائیگا لیکن صبح سے شام ہو گئی تھی اور وہ نہیں آیا ـــــ صاف ظاہر تھا کہ شادو کی شہہ پر پنڈ والوں نے اُسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

جناب علی نے غرا کر مائی خیراں کی چھت کی جانب دیکھا۔ شادو چولہا جلا کر ہانڈی چڑھا رہی تھی۔

برکتے نے اپنے بہنوئی سے کہا۔

"تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا ـــــ ہمیں حویلی کے دروازے اور کھڑکیوں کو اچھی طرح بند کر دینا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساجے اندھیرے میں چھپ کر حویلی میں داخل ہو جائے۔"

جناب علی نے شادو کو گالیاں دیتے ہوئے کہا ـــــ "اس چھپکلی کی وجہ سے وہ ہوشیار ہو گیا ہے ـــــ تم ایسا کرو کہ اپنے آدمیوں کو لے کر مائی خیراں کی چھت پر جاؤ اور شادو اور مائی خیراں کو پکڑ کر حویلی میں لے آؤ۔"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

بہت فائدہ ہو گا۔ ساجے کو جب معلوم ہو گا کہ اس کی ماں اور پرانی محبوبہ حویلی میں قید ہیں تو وہ جھنجھلا کر ضرور ادھر آئے گا۔"

برکتے نے کہا۔

جناب علی ـــــ تُو انتقام کے جوش میں یہ بھول رہا ہے کہ ساجے ایک فوجی افسر ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اُٹھا ـــــ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہا ہوں ـــــ تُو دیکھتا جا کہ میں ساجے کو کس طرح بے بس کر کے ماروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ حویلی کے اندر آ گیا۔

اوپری منزل میں آ کر اس نے ریشماں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا وہ بال بکھرائے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ باپ کو دیکھتے ہی وہ پلنگ سے نیچے اُتری اور دروازے پر آئی اور روتی ہوئی کہنے لگی۔

"ابا ـــ یہ سب کیا ہو رہا ہے ـــــ ؟ تم میرے سہاگ کے دشمن کیوں بن گئے ہو ؟"

"میں تیرا دشمن نہیں بنا ـــ ساجے میرا دشمن بن گیا ہے ـــ کیا تجھے میرے سر کا زخم نظر نہیں آ رہا ہے ؟"

"وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ خوامخواہ کسی کو زخمی کر دیں ـــ انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے ـــ رالو کی حفاظت کے لئے کیا ہے ۔ زیادتی تمہاری ہے ۔ تمہارے آدمی اسے اٹھا کر لے گئے تھے" ـــ ریشماں نے ساجے کی حمایت میں کہا ۔

"بکواس مت کر ـــ ساجے سے دو دن کی یاری ہو گئی ہے تو باپ کے احسانوں کو بھول گئی ہے ـــ یاد رکھ ـــ یہ تیرا باپ ہی تیرے کام آئے گا ـــ ساجے دو گھڑی کا مہمان ہے ۔ وہ جب بھی یہاں آئے گا اپنی موت کو ساتھ لے کر آئے گا ۔"

ریشماں نے گھبرا کر اپنے باپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا ۔ پھر جنونی انداز میں اسے جھنجھوڑتی ہوئی بولی ۔

"تم کیسے باپ ہو ۔ بیٹی کا سہاگ اُجاڑنے کی کوشش کر رہے ہو ۔ کیا تمہارے دل میں میری ذرا سی بھی محبت نہیں ہے ۔؟"

"میں بیٹی سے ایسی اندھی محبت نہیں کرتا کہ میری جان خطرے میں

ڈالتے ـــ ساجے کا خیال دل سے نکال دے ـــ اس کو رہا کر دے ۔"

"نہیں ابا ـــ ان سے پہلے مجھے مار ڈالو ـــ مجھے اس گھر سے نفرت ہو گئی ہے ـــ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے ـــ مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہو گئی ہے ۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی ۔"

جناب علی نے اسے زور سے دھکا دیا ۔ وہ فرش پر گر پڑی ۔ اس سے غرا کر کہا ۔

"مجھے اپنی جان بچانے کے لئے تجھے بھی مارنا پڑا تو میں مار ڈالوں گا ۔ بہتری اسی میں ہے کہ ساجے کا نام اب تم اپنی زبان پر نہ لانا ـــ میں جو کچھ کر رہا ہوں ۔ اسے تقدیر کا تماشہ سمجھ کر خاموشی سے دیکھتی جا ۔"

یہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا ۔

نیچے زینے کی طرف سے شادو اور مائی خیراں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی ۔ برکتے اپنے آدمیوں سے کہہ رہا تھا ۔

"دروازے اور کھڑکیاں اندر سے اچھی طرح بند کر دو اور تم دونوں باہر جاؤ ـــ دینو کی لاش کو کہیں دُور پھینک کر مائی خیراں کی چھت پر محاذ بنا لو ۔"

شادو چیخ چیخ کر رو رہی تھی ۔

"ہائے ربا ـــ میں یتیم ہو گئی ـــ مجھے میرے ابا کے پاس جانے دو ۔

مجھے چھوڑ دو ـــــ مجھے چھوڑ دو"۔

برکتے اسے گھسیٹتے ہوئے اوپری برآمدے میں لے آیا ـــــ "

آدمی مائی خیراں کو پکڑے ہوئے تھا ـــــ مائی خیراں کے سر سے اور نا

کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں

نے بہت مزاحمت اور جدوجہد کی ہے اور بڑی مشکلوں سے اللہ

قابو میں آئی ہیں۔

ریشماں دوڑتی ہوئی اپنے ماموں برکتے کے پاس آئی اور اس

جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔

"ماما ـــــ عورتوں پر ظلم کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ـــــ

ماں جی کو چھوڑ دو ـــــ شادو کو ہاتھ نہ لگاؤ ـــــ نہیں تو میں ساجے

کی نظروں میں گر جاؤں گی ـــــ وہ میرے متعلق کیا سوچے گا"۔

برکتے نے غصے سے کہا۔

وہ تمہارے متعلق سوچنے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔ ہٹ جا

میرے راستے سے"۔

اس نے ریشماں کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر ذرا پیچھے گئی اور پھر آگے

بڑھ کر شادو سے لپٹ گئی۔

"نہیں ـــــ تم نے اس کے باپ کو مار ڈالا ہے ـــــ تم اسے بھی

لگے ـــــ میں اسے نہیں چھوڑوں گی ـــــ میرے جیتے جی تم اب اس

لم نہیں کر سکو گے"

جناب علی نے بیٹی کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر کھینچا اور غصے سے

لاتے ہوئے کہا۔

چھوڑ دے اسے"۔

نہیں ـــــ تم مجھے مار سکتے ہو ـــــ مگر شادو کو مجھ سے نہیں

سکتے"۔

ریشماں کی ماں بھی آگئی۔ وہ بھی اپنی بیٹی ریشماں کو سمجھانے لگی کہ

سروں کے لئے خوامخواہ اپنی جان ہلکان نہ کرے۔ لیکن ریشماں

اور بدستور شادو سے لپٹی رہی۔

جناب علی اور برکتے اسے مار مار کر شادو سے الگ کرنے لگے۔ شادو

اس نہیں تھی۔ ریشماں اگر اس کی حفاظت کر رہی تھی تو وہ بھی ریشماں

کے باپ اور ماموں برکتے کی مار سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

لئے ڈھال بنتی جا رہی تھی۔

ئی خیراں کو اس کے زخم اور اس کے بڑھاپے نے نڈھال کر دیا تھا۔

تہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔ چپکے چپکے رو رہی تھی اور ساجے کی بیوی

جے کی محبوبہ کو محبت کے سنگم پر گلے ملتے اور ایک دوسرے کی حفاظت

کرتے دیکھ رہی تھی۔

پھر دونوں ہی لڑکیاں مار کھاتے کھاتے نڈھال ہوگئیں۔ ریشماں بیہوش ہوکر گر پڑی اور شادو کو برکتے زمین پر گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ مائی خیراں بھی دھکے کھا کر آگے بڑھنے لگی۔

ریشماں کی ماں اپنی بیہوش بیٹی سے لپٹ کر رو رہی تھی اور اس کے باپ سے التجا کر رہی تھی کہ وہ اسے اٹھا کر کمرے میں لے چلے۔

"میں ایسی دشمن اولاد کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا ــــ مرتی ہے تو اسی طرح مرجانے دو۔"

وہ غصے میں طنطناتا ہوا حویلی کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک کمرے میں چودھری کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ اس نے کھڑکی کی سلاخوں سے کمرے کے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔

"چودھری ــــ میرے اندازے غلط نہیں ہوتے ــــ ناصرہ کو تیرا بیٹا حمیدے اٹھا کر لے گیا ہے ــــ جو لوگ پرانے مکان کی تلاشی لینے گئے تھے، حمیدے نے انہیں فائرنگ کر کے بھگا دیا ہے۔ اب تیرا بیٹا بھی اتنا ہی مجرم ہے جتنا کہ میں ہوں۔"

چودھری پریشان ہوکر اسے خاموشی سے تکنے لگا۔ اسے پہلے ہی سے شبہ تھا کہ حمیدے ناصرہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔

جناب علی نے کہا۔

"رابو کو اغوا کرنے کے جرم میں تو مجھ پر مقدمہ چلائے گا ــــ تو بھی کرم دین کی طرف سے تیرے بیٹے حمیدے کو عدالت میں بلاؤں ــــ اگر یہ مقدمے بازی تجھے پسند ہے تو پھر کوئی بات نہیں اور اگر پسند نہیں ہے تو اچھی طرح سوچ لے ــــ ہمارے درمیان سمجھوتہ بھی ہو سکتا ہے۔"

چودھری سوچنے لگا۔

ایک طرف غیرت کا سوال تھا کہ بیٹی اغوا کی گئی تھی ــــ دوسری طرف عزت کا سوال تھا کہ بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں ــــ فیصلہ کرنا تھا کہ بیٹا زیادہ عزیز ہے یا بیٹی ــ؟

جناب علی نے مسکرا کر کہا۔

"اس وقت کرم دین میرا احسان مند ہے ــــ میں جو کہوں گا ــ وہ مان جائے گا ــــ ہزار دو ہزار روپے دے کر ہم اس کی بیٹی کی شادی کسی اور جگہ کر دیں گے ــــ بیٹیاں پرائی امانت ہوتی ہیں ــــ تیری بھی ایک دن پرائی ہو جائے گی۔ لیکن حمیدے سے تیرے خاندان کا چلنے والا ہے۔ اس لئے اسے بدنام نہ ہونے دے ــــ ناصرہ اور رابو کو بھی چپکے سے کہیں بیاہ دے ــــ یہ سارا جھمیلا خود بخود

ختم ہو جائے گا۔"

"مگر ۔۔۔ پنڈ والے کیا کہیں گے؟"

"پنڈ والوں نے پہلے کیا کہا ہے ۔۔۔ جو اَب کہیں گے ۔۔۔ دولت کے سامنے مفلسی نہیں بولتی ۔۔۔ زور آور کے سامنے کمزور لوگ بے زبان بن جاتے ہیں ۔۔۔ صرف ساجے کی شہ پاکر کچھ لوگ زبان کھول رہے ہیں۔ ساجے نہ رہے گا تو ان کی زبانیں بھی بند ہو جائیں گی۔"

"مم ۔۔ مگر میں ساجے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا ۔۔۔ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

جناب علی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ احسان کرنے والا اب تیری بیٹی کے ساتھ عیش کر رہا ہے۔"

"بکواس مت کر ۔۔۔ تو ایک شریف آدمی پر الزام لگا رہا ہے۔"

"میں الزام نہیں لگا رہا ہوں ۔۔۔ وہ ابھی تک تیری بیٹی کو لے کر واپس نہیں آیا ہے ۔۔۔ ذرا عقل سے کام لے چودھری اور یہ سوچ کہ میں نے ایک ہی رات میں اپنی ریشماں کا نکاح اس سے کیوں پڑھایا تھا ۔۔۔ صرف اس لئے کہ اس نے میری بیٹی ریشماں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا ۔۔۔ میں نے اور برکتے نے اسے رائفل کی زد پر رکھ کر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ریشماں سے شادی کر لے

اس بات کی گواہی خود اس کی ماں خیراں بھی دے سکتی ہے۔"

اس نے برکتے کو آواز دے کر کہا کہ مائی خیراں کو یہاں لے آئے۔

تھوڑی دیر میں برکتے اسے کھڑکی کے پاس لے آیا۔ جناب علی نے کہا۔

"ماں خیراں ۔۔۔ اگر تو سچی اور ایماندار ہے تو چوہدری سے بتا دے کہ تیرے بیٹے نے شادی سے پہلے ریشماں سے کیا سلوک کیا تھا؟"

مائی خیراں نے اسے گھور کر نفرت سے دیکھا۔ پھر چوہدری سے بولی۔

"جو کچھ بھی ہوا تھا، دونوں کی غلطی سے ہوا تھا۔"

جناب علی نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میری لڑکی نے بہکایا اور ساجے بہک گیا۔"

"ہاں ۔۔۔ ایسی حالت میں کوئی بھی بہک سکتا ہے۔"

"برکتے ۔۔۔ اس بڑھیا کو لے جاؤ۔ مجھے بس اتنا ہی پوچھنا تھا۔"

مائی خیراں نے کہا۔

"تم گڑے مردے کیوں اکھاڑ رہے ہو۔ چوہدری کے سامنے اپنی بیٹی اور داماد کے عیب کھولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ۔۔۔۔"

وہ بڑبڑاتی رہی اور برکتے اسے کھینچتا ہوا واپس لے گیا۔

جناب علی نے چوہدری سے کہا۔

"سن لیا تم نے — ساجے فرشتہ نہیں ہے، تنہائی میں کوئی لڑکی مل جائے تو وہ ہماری طرح بہک سکتا ہے — اور مہمان خانے میں تنہائی ہے۔ اس نے ہم سب کو بیوقوف بنا کر یہاں بھیج دیا ہے۔ ہم یہاں اس کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ وہاں گلچھرے اڑا رہا ہے۔"

چوہدری نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر کہا۔

"نہیں — مجھے یقین نہیں آتا . . ."

"جب اجڑی ہوئی بیٹی کو دیکھو گے تو یقین آجائے گا۔ اس وقت بھی مائی خیراں یہی کہے گی کہ اس کے بیٹے کا قصور نہیں ہے۔ رالو نے بہکایا اور وہ بہک گیا . . ."

"میں ساجے کو شوٹ کردوں گا۔ مجھے مہمان خانے میں لے چلو۔ اگر یہ سچ ہوا تو میں تم سے سمجھوتہ کر لوں گا۔"

جناب علی نے سنتے ہوئے کہا۔

"میں کچا کھلاڑی نہیں ہوں، جب تک ناصرہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ اس وقت تک میں تمہیں رالو کے قریب نہیں جانے دوں گا — پھر یہ کہ ساجے مہمان خانے میں تنہا نہیں ہوگا۔ وہاں میری دو رائفلیں

رکھی ہوئی ہیں۔ وہ پنڈ کے کسی نوجوان کو اپنے اعتماد میں لے کر وہاں محاذ قائم کر چکا ہوگا۔ ہمارا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے اسی لئے میں نے شادو اور مائی خیراں کو یہاں قید کیا ہے تم دیکھ لینا، جب اسے یہ خبر ملے گی تو وہ اپنے محاذ کو چھوڑ کر یہاں آنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

اتنے میں برکتے وہاں آگیا۔ جناب علی دروازے کا تالا کھول کر چوہدری کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"چوہدری — یہ نہ بھولو کہ یہ سیلاب ہماری وجہ سے آیا ہے اگر ہم ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تو یہ راز دوسروں کے سامنے کھل جائے گا۔ تم اس طرح سوچو کہ اگر رالو کو اٹھالے جانے کے جرم میں میں پکڑا گیا اور جب مجھے جیل ہی جانا پڑا۔ تو میں پھر اس راز کو نہیں چھپاؤں گا۔ تمہیں بھی اپنے ساتھ جیل میں بلاؤں گا — حمیدے بھی اغوا کے سلسلہ میں گرفتار ہوگا۔ ہم دونوں کے گھر تباہ ہو جائیں گے۔ برسوں کی بنائی ہوئی عزت اور رعب اور دبدبہ سب خاک میں مل جائے گا۔ اب بھی وقت ہے ہم اپنے گھروں کو تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔"

چوہدری نے سر جھکا کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر میں نے ایک رالو کی وجہ سے تم سے دشمنی کی تو ہمارے گھر تباہ ہو جائیں گے۔ میں دولت کے زور پر رالو کی بدنامی پر پردہ ڈال سکتا ہوں۔ میں ہر طرح تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار رہوں۔ تم سے صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ رالو کو کسی نہ کسی طرح ساجے سے چھڑا کر لے آؤ۔"

"یہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ پہلے ہم حمیدے کے پاس جائیں اور وہاں سے ناصرہ کو لے کر آئیں۔ پھر ہم سب مل کر مہمان خانے کو گھیریں گے اور ساجے کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساجے خود ہی آج رات کو کسی وقت یہاں آنے کی کوشش کرے۔"

چوہدری نے کہا،

"وہ آئے گا تو اس سے نمٹنے کے لئے یہاں کافی لوگ ہیں ہمیں پہلے حمیدے کے پاس چلنا چاہیئے۔"

"اب تو اندھیرا پھیل گیا ہے۔ کیا رات کے وقت اس سیلاب میں تم اتنی دور جا سکتے ہو؟"

چوہدری بے بسی سے سوچنے لگا۔ جناب علی نے کہا۔

"ہم میں سے کوئی بھی رات کے وقت پانی میں نہیں چل سکتا اور نہ ہی اتنی دور تک تیر کر جا سکتا ہے۔ تم صبح میرے دو آدمیوں کے ساتھ چلے جانا اور حمیدے اور ناصرہ کو ساتھ لے آنا۔ حمیدے بھی آ گیا اور ہم سب نے مل کر ایک محاذ بنا لیا تو پھر ساجے ہمارے سامنے بے بس ہو جائے گا۔"

ساجے پر اب ایک نہیں دو الزامات عائد ہوں گے۔ ایک تو اس کی وجہ سے سیلاب آیا اور پنڈ تباہ ہو گیا۔ اور دوسری رالو اس کے ہاتھوں تباہ ہو گئی ہے۔ . . ."

چوہدری غصہ سے دانت پیسنے لگا۔ وہ جھنجھلا کر مٹھیاں بھینچ رہا تھا اور خیال ہی خیال میں ساجد کی بوٹیاں چبا رہا تھا۔

تم غریب ہو، مگر تمہارا دل مجھ سے زیادہ
امیر ہے۔ میں نے تمہیں یہاں لاکر بدنام کر دیا
اور تم مجھے بدنامی سے بچانے کیلئے کہیں دور
چلی جانا چاہتی ہو۔"

حمیدے کے لئے دوپہر کا کھانا ناصرہ تیار کر رہی تھی
وہ تھوڑی دیر تک پلنگ پر خاموشی سے پڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر
اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ملازم کو آواز دینے لگا۔
ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں آگیا۔ حمیدے نے اٹھتے ہوئے کہا
"میرے ساتھ چلو، میں پنڈ کی طرف جاؤں گا۔"
وہ رائفل اور کارتوس کی پیٹی اٹھا کر دوسرے کمرے میں ناصرہ
کے پاس آیا اور بولا۔
"میں پنڈ جا رہا ہوں۔ اگر واپس نہ آیا تو گھبرانا نہیں۔ پنڈ والے
تمہیں آکر لے جائیں گے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

"نہیں — میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ جناب علی کے آدمی تمہیں پکڑ لیں گے۔"

"میں بزدل نہیں ہوں کہ جناب علی کے ڈر سے یہاں چھپا رہوں مجھے جب تک رابو کی خیریت معلوم نہیں ہو گی، دل کو سکون نہیں ملے گا۔"

"رابو کی خیریت یہاں رہ کر بھی معلوم ہو سکتی ہے۔" ناصرہ نے کہا۔ "تم کسی ایک ملازم کو وہاں بھیج دو۔"

"نہیں ناصرہ! میں کب تک یہاں چھپا رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن پنڈ والوں کے سامنے جانا ہو گا۔"

"جب وہ دن آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"تمہارے فیصلہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں مجرم ہوں، مجرم ہی کہلاؤں گا۔"

"کون تمہیں مجرم کہتا ہے۔ تلاشی لینے والے یہاں آئے تھے۔ لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے آزاد کر دو۔ میں یہاں سے کہیں اتنی دور چلی جاؤں گی کہ کوئی مجھے تلاش نہیں کر سکے گا۔ کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ تم مجھے یہاں لائے تھے۔"

حمیدے اسے بڑی محبت سے اور بڑی عقیدت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ملازموں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں سر جھکا کر باہر چلے گئے۔ اس نے ناصرہ کی گردن میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔

"تم مجھ سے دور چلی جاؤ گی؟"

وہ سر جھکا کر چلی گئی۔

"ہاں —!"

"کیا میں اتنا برا ہوں کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم برے ہو۔ جو اپنی غلطی کو سمجھ لے اس سے اچھا آدمی کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔"

"اچھا سمجھتی ہو تو پھر میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں آزاد نہیں کرنا چاہتا ساری زندگی تمہیں اپنی قید میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے بانہوں کا حلقہ تنگ کر دیا۔ اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"نہیں حمیدے — میں غریب ہوں تمہارے قابل نہیں ہوں۔

مجھے اتنے میٹھے سپنے نہ دکھاؤ۔"

"تم غریب ہو۔ مگر تمہارا دل مجھ سے زیادہ امیر ہے۔ میں نے تمہیں یہاں لاکر بدنام کر دیا اور تم مجھے بدنامی سے بچانے کے لئے کہیں دور چلی جانا چاہتی ہو۔ تم کتنی اچھی ہو۔ اتنی اچھی شریک حیات کسی خوش نصیب کو ہی ملتی ہے اور میں بہت خوش نصیب ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔

"حمیدے — یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تم مجھے سپنے سے لگا کر دیکھو گے تو میں اچھی نظر آؤں گی۔ مجھ سے دور ہو کر اپنی حویلی میں بیٹھ کر فیصلہ کرو۔ غریبی امیری کے فرق کو سمجھو۔ چودھری اور چودھرانی کے مزاج کو یاد کرو۔ وہ مجھ جیسی لڑکی کو کبھی اپنی بہو بنائیں گے۔"

"وہ تمہیں بہو بنائیں گے یا نہیں — یہ سوچنا میرا کام ہے۔ میں تمہاری بے یقینی کو سمجھتا ہوں۔ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ امیری غریبی کا میل نہیں ہوتا۔ لیکن جب میں تمہیں دلہن بنا کر لاؤں گا۔ تو تمہیں یقین آجائے گا۔"

ناصرہ خاموش رہی۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھی۔ مگر بول نہ سکی۔ وہ صبح سے حمیدے کے خیالات اور احساسات کو بدلتے دیکھ رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور اسے اپنی دلہن بنائے گا۔

لیکن غریبی کے تجربات اسے جھٹلا رہے تھے۔

حمیدے نے کہا۔

"ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے۔ ساجے نے رابو کی عزت بچا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ میرا دشمن نہیں ہے۔ میں اپنے ملازم کو بھیج کر اسے یہاں بلاتا ہوں۔ وہ قانون کا محافظ ہے۔ ہمارے بارے میں وہ جو بھی فیصلہ کرے گا۔ اسے ہم قبول کر لیں گے۔"

"ہاں — یہ بڑی اچھی تدبیر ہے۔" ناصرہ نے کہا۔ "ساجے سے ملے گا تو رابو کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

حمیدے اس سے الگ ہو کر کمرے سے باہر آیا اور ایک ملازم سے کہنے لگا۔

"تم جا کر ساجے سے ملو۔ اس سے کہنا کہ رابو کی عزت بچائی ہے تو حمید سے بھی بھائی بنکر ملو۔ میں اس سے تنہائی میں ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں ...."

ناصرہ چولہے کے سامنے بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر شرما رہی تھی اور زیر لب مسکرا رہی تھی۔

حمیدے رائفل اور کارتوس کی پیٹی رکھ کر اس کے پاس آگیا۔

اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"چلو اٹھو ۔۔۔!"

"کہاں چلوں ۔۔۔؟"

"کمرے میں ۔۔۔!"

"نہیں، مجھے پکانے دو۔"

"جب تمہارے پکانے کا وقت آئے گا تو خوب پکا کر کھلانا۔"

اس نے ملازم کو آواز دی کہ وہ آکر ہانڈی چولہا سنبھالے۔ پھر وہ ناصرہ کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ دونوں پچھلی رات سے جاگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ پلنگ پر لیٹے پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کی آغوش میں سو گئے۔

شام کو ملازم کی آواز سن کر ان کی آنکھ کھلی۔ وہ دروازے پر دستک دے کر کہہ رہا تھا کہ ساجے آرہے ہے۔ وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ حمیدے نے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا، ساجد تنہا آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ملازم نہیں تھا۔ اس نے دور سے حمیدے کو کھڑکی کے پاس دیکھ کر کہا۔

"حمیدے ۔۔۔! ناصرہ کہاں ہے اسے میرے حوالے کر دے۔"

حمیدے نے چیخ کر کہا۔

"ساجے ۔۔۔ میں تیری عزت کرتا ہوں۔ تجھ سے بھائی بنکر ملنا چاہتا ہوں اسی لئے میں نے اپنے ملازم کو تیرے پاس بھیجا تھا۔"

"تیرا کوئی ملازم میرے پاس نہیں آیا اور نہ ہی میں تیرے مکان میں آنا چاہتا ہوں۔ تو ناصرہ کو باہر بھیج دے۔"

ناصرہ نے کھڑکی کے پاس آکر کہا۔

"ساجے ۔۔۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ حمیدے کو دشمن نہ سمجھو یہاں آجاؤ۔ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ساجے کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

دوست اور دشمن کی پہچان ابھی ہو جاتی ہے۔ میں جو کہوں، اس پر عمل کرو۔ اور یہاں میرے پاس آجاؤ۔"

ناصرہ نے حمیدے سے کہا۔

"ساجے کی تسلی کے لئے مجھے وہاں جانا ہی ہوگا۔ میں اس کی غلط فہمی دور کر کے اسے یہاں لے آؤں گی۔"

حمیدے نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ وہ بہت محتاط ہے۔ تمہیں جانا ہی چاہیئے۔۔۔"

ناصرہ وہاں سے پلٹ کر چلی گئی۔ حمیدے نے ساجد سے پوچھا۔

"ساجد — رابو کہاں ہے؟"

"جناب علی کے مہمان خانے میں ہے اور خیریت سے ہے۔ وہاں میرے آدمیوں کا سخت پہرہ ہے۔"

حمیدے کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے پوچھا۔

"تم نے رابو کو گھر کیوں نہیں پہنچایا۔؟"

"جناب علی اور اس کے آدمیوں نے چوہدری کو قید کر لیا ہے اور وہ مجھے اور رابو کو گھیرنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں اسے گھر پہنچانا مناسب ہے؟"

حمیدے نے طیش میں آکر کہا۔

"اس بدمعاش نے ابا کو قید کیا ہے۔ میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔"

ساجد نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کو اپنی اپنی کرنی کا پھل مل رہا ہے۔ خدا تم لوگوں کو عقل دے۔"

حمیدے غصہ سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ کھڑکی کے نیچے ناصرہ پالی چلتی ہوئی ساجد کی طرف جا رہی تھی۔

ساجد نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم حمیدے کو دشمن نہیں سمجھتی ہو؟"

وہ چند قدموں کے فاصلہ پر آکر رک گئی اور سر پہ آنچل رکھ کر دھیرے سے بولی۔

"میرے نصیب بگڑتے بگڑتے پھر بن رہے ہیں۔ وہ ایک شریف آدمی کی طرح مجھے اپنا بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔"

ساجد نے غیر یقینی نظروں سے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پھر ناصرہ سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ حمیدے تم سے وفا کرے گا۔؟"

"مجھے یقین ہے — ساجے! میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ میری بگڑی ہوئی تقدیر بنانے کے لئے تم بھی میری مدد کرو۔ حمیدے کو حراست میں نہ لو۔"

اس نے سر ہلا کر کہا۔

"اب اسے حراست میں لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم اس کی حمایت کر رہی ہو۔ اس لئے وہ قانونی گرفت میں نہیں آئیگا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔

"تو پھر میرے ساتھ چلو۔ وہ تم سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں ناصرہ ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ بلکہ تم میرے ساتھ چلو گی۔ جب تک حمیدے سے تمہارا نکاح نہیں ہوتا۔ اس وقت تک تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے ۔"

پھر اس نے کھڑکی کی جانب دیکھ کر کہا۔

"حمیدے ۔ اگر تم رالو سے ملنا چاہتے ہو تو یہاں آ جاؤ۔"

حمیدے کھڑکی سے گھوم کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ناصرہ کچھ اداس ہو گئی تھی۔ ساجد اسے حمیدے سے دور کر دینا چاہتا تھا اور وہ اعتراض بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا۔ قاعدے اور قانون کے مطابق کہہ رہا تھا۔

حمیدے اپنے مکان سے نکل کر ان کی طرف آنے لگا۔ اسی وقت اس کا دوسرا ملازم بھی پنڈ کی طرف سے واپس آ رہا تھا۔

حمیدے نے بگڑ کر کہا۔

"میں نے تجھے ساجے کے پاس بھیجا تھا۔ اور تو اب واپس آ رہا ہے۔ کہاں مرنے گیا تھا؟"

اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

"سرکار ۔ اس وقت سارے پنڈ میں جناب علی کی حکومت ہے اس نے صبح چوہدری صاحب کو اپنی حویلی میں بند کر دیا تھا۔ ابھی تھوڑی

دیر پہلے مائی خیراں اور شادو کو اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے ہیں ۔"

ساجد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بوڑھی ماں اور مظلوم شادو کا چہرہ گھومنے لگا۔ ملازم کہہ رہا تھا۔

"صرف اتنا ہی نہیں، انہوں نے شادو کے باپ کو بھی مار ڈالا ہے۔"

ساجد کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی، سارا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ اس کی مردانگی اسے بھڑکا رہی تھی کہ وہ ابھی حویلی میں جائے اور جناب علی کی بوٹیاں کاٹ کر پھینک دے ۔ مگر وہ سختی سے دانت پر دانت جمائے اپنے جوش و جنون کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ وہ قانون کا محافظ ہو کر بھی دشمن سے اندھا انتقام نہیں لے سکتا ہے۔

حمیدے نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"ساجے ۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے ہم ابھی جا کر جناب علی سے انتقام لیں گے ۔"

ملازم نے کہا۔

"سرکار ۔ حویلی تک پہنچنے کے تمام راستوں پر جناب علی کے مسلح آدمی بیٹھے ہیں۔ حویلی کے اندر پہنچنا بھی ناممکن ہے۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں ۔"

حمید نے جھنجھلا کر ساجد کو دیکھنے لگا۔

ساجد نے بڑے سکون سے کہا۔

"ہمیں غصہ ہونے اور جھنجھلانے کی بجائے کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہیئے جس پر عمل کر کے ہم حویلی کے اندر پہنچ سکیں ۔ آؤ ہم اطمینان سے بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیں گے ۔"

وہ مکان کی جانب بڑھنے لگا۔ حمیدے اور ناصرہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگے۔ اس وقت اس کے ذہن میں ماں کی بوڑھی فریادیں گونج رہی تھیں اور دل میں شاد و بیٹھی رو رہی تھی ۔

جا۔ برکتے ۔ ! شاد و تیرا انعام ہے ۔ مگر ذرا جلدی آجانا ۔ مجھے یقین ہے کہ ساجے اس حویلی میں ضرور آئیگا۔

رابو مہمان خانے کے ایک کمرے میں گم سم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے دور دور ایک عورت کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنے بچّے کو دودھ پلا رہی تھی۔ قریب ہی اس کا خاوند فرش پر سو رہا تھا۔ تاکہ نیند پوری کر کے رات کو پہرہ دے سکے۔ چھت پر اس کے دو جوان بیٹے اس وقت بھی پہرہ دے رہے تھے۔ اور دوسرے کمرے میں کالے خاں رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔

اس چھوٹے سے خاندان کو ساجد پنڈ سے بُلا کر لے آیا تھا۔ وہ بیچارے بہت غریب تھے۔ یہاں جناب علی کے ذخیرے سے انہیں کافی اناج مل رہا تھا۔ اور وہ دل و جان سے ساجد کے کام آ رہے

تھے۔

رابو کا پچھلا جوش اور جنون سرد پڑ گیا تھا۔ جب تک ساجد اس کے سامنے تھا، وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ ایک ہیجانی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ دل کی دیوانگی ایسی بڑھی تھی کہ وہ اپنے مقام سے بھی گر کر اسے اپنا لینا چاہتی تھی۔

اب ساجد اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ شعلہ جو اسے جل جانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس سے دور چلا گیا تھا۔ اس لئے وہ بھی سرد پڑ گئی تھی۔ اور مدہوشی کی دلدل سے نکل کر پورے ہوش و حواس سے اپنا جائزہ لے رہی تھی۔

سب سے پہلے اس کا دھیان اپنے پھٹے ہوئے گریبان پر گیا۔ وہ جلدی سے اسے درست کرنے لگی۔ اس گریبان کی وہ دوبارہ سلائی کر سکتی تھی لیکن اس کے بہکانے پر ساجد بھی اگر بہک جاتا تو عزت کی دھجیوں کو سمیٹنا ناممکن ہو جاتا۔

اس کا سر ندامت سے جھک گیا۔

ساجد کی محبت اس کے دل میں اور گہرائی تک اتر گئی۔

کچھ بھی ہو۔ وہ ماں باپ کی صندی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ جو چیز اسے پسند آجاتی۔ اسے حاصل کر کے ہی رہتی تھی۔ ساجد نے اُسے

ٹھکرایا۔ یہ بھی اس کا احسان تھا۔ کیونکہ وہ ٹھوکر اس کی عزت کی سلامتی کے لئے تھی۔ وہ اپنی غلطی پہ نادم ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سنگدل کے خیال کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔

اس کے مزاج میں عجیب تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اپنی ناکامی کو بھی ساجد کا احسان سمجھتی تھی اور آئندہ کامیابی کی توقع رکھتی تھی۔ محبت میں سب لوگ کہتے ہیں کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی — لیکن یہاں صرف اس کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی اور یہ آگ بجھنے والی نہیں تھی۔

ساجد جب سے گیا تھا لوٹ کر نہیں آیا تھا۔

رابو کو اس کا انتظار تھا۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ نہ آئے۔ آئے گا تو نہ جانے دل کی دیوانگی کیا رنگ لائے گی — اس کا انتظار بھی تھا اور اپنی کمزوریوں کا ڈر بھی تھا۔

رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔

نگرانی کرنے والی عورت نے اس کے آگے روٹیاں لاکر رکھیں۔ تو کھانے کو اس کا دل نہ چاہا۔ حالانکہ وہ صبح سے بھوکی تھی — وہ کیا کرتی؟ اس سمن بے پرواہ کا بھی خیال تھا کہ اس نے بھی صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے۔

رات کے نو بجے دور پانی میں چھپ۔ چھپ کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید آ رہا تھا۔

رابو کا دل دھڑکنے لگا۔

نگرانی کرنے والے تینوں افراد چوکنے ہو گئے۔ ایک نے کہا۔

"ساجے اکیلا نہیں ہے۔ پانی میں کئی آدمیوں کے چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔"

دو آدمی فوراً ہی رائفلیں لے کر چھت پر چلے گئے۔ تیسرا آدمی کھڑکی کے پاس آکر باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی وقت اندھیرے سے تھانیدار کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"جناب علی — تیرے مہمان خانے میں کون کون ہے؟"

تیسرے آدمی نے کھڑکی پر سے جواب دیا۔

"یہاں جناب علی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی آدمی ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" تھانیدار نے کہا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ چودھری کی بیٹی یہاں اٹھا کر لائی گئی ہے۔"

"ہاں — چودھری کی بیٹی یہاں موجود ہے اور ہم ساجے کے حکم پر اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ساجد صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ کہیں گئے ہیں ۔"

"کہاں گئے ہیں ۔۔ ؟"

"ہم نہیں جانتے ۔۔ !"

"کب آئیں گے ۔۔ ؟"

"یہ بھی ہم نہیں جانتے ۔۔ !"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ رابو کو لیکر مکان سے باہر آجاؤ ۔"

"ہم مجبور ہیں تھانیدار صاحب ! ساجے کے حکم کے بغیر نہ ہم باہر جا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی اندر آسکتا ہے ۔"

"بکواس مت کرو ۔ میں اس علاقہ کا تھانیدار ہوں۔ میں مکان کے اندر آکر حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ ساجد صاحب کے حکم سے یہاں موجود ہو یا ان کی آڑ لے کر رابو پر ظلم کر رہے ہو ۔"

رابو تیزی سے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی اور دور اندھیرے میں دیکھتی ہوئی بولی ۔

"یہاں مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا ہے ۔ یہ لوگ ساجے کے حکم پر میری نگرانی کر رہے ہیں ۔ میں یہاں بالکل محفوظ ہوں ۔"

تھانیدار کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں ۔ اس نے پوچھا ۔

"تم یہاں ساجد صاحب کے پاس کیوں ہو ؟ اپنے ماں باپ کے پاس چلو۔ میں تمہیں حفاظت سے وہاں پہنچا دوں گا ۔"

"ارے تم کیسے تھانیدار ہو ؟" رابو نے پوچھا ۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ پنڈ میں کیا ہو رہا ہے ۔ جناب علی نے میرے ابا کو حویلی میں بند کر دیا ہے ۔ اب وہ میرے اور ساجے کے پیچھے پڑ گیا ہے ۔ پہلے جا کر اسے حراست میں لو۔"

"میں ابھی جا کر اس کی خبر لوں گا ۔ لیکن پہلے مجھے مکان میں آنے دو۔ میں تسلّی کرنا چاہتا ہوں ۔"

رابو کے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے کہا ۔

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس مکان کا دروازہ نہیں کھلے گا ۔"

تھانیدار نے کہا ۔

"اُلّو کے پٹھے ۔ میرے حکم سے انکار کرتا ہے ۔ میں یہاں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ سپاہی بھی ہیں ۔ اگر تو نے دروازہ نہ کھولا تو میں فائرنگ کا حکم دوں گا ۔"

رابو کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی ۔ اس آدمی نے کمرے کی لالٹین بجھا دی پھر اس نے چیخ کر کہا ۔

"میں بھی یہاں اکیلا نہیں ہوں ۔ اگر تمہاری طرف سے فائرنگ ہوئی تو مجبوراً ہمیں بھی جواب دینا پڑے گا ۔"

اوپر چھت سے بھی آواز آئی ۔

"تھانیدار صاحب ۔ ! ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ اپنے سپاہیوں کے ساتھ یہاں سے واپس چلے جائیں ۔"

تھانیدار اور اس کے سپاہی اندھیرے میں چھت کی طرف گھورنے لگے اس تاریکی میں وہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ چھت پر کتنے آدمی ہیں۔ لیکن اتنا وہ جانتے تھے کہ ساجے ایک فوجی جوان ہے ۔ اس کا بنایا ہوا محاذ کمزور نہیں ہوگا ۔ وہ محض رعب جما کر راجو کے پاس پہنچنا چاہتا تھا ۔ لیکن فائرنگ کر کے ساجد کا دشمن بن جانا گوارا نہ تھا ۔

اس نے مجبوراً کہا ۔

"اچھی بات ہے میں پنڈ جا کر ساجد صاحب کو تلاش کرتا ہوں ۔ پھر تم لوگوں سے بھی سمجھ لوں گا ۔"

وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ میں بڑبڑاتا ہوا اپنے سپاہیوں کے ساتھ پنڈ کی طرف جانے لگا ۔

شادو ایک کمرے میں قید تھی ۔

جناب علی اور برکتے نے اس بُری طرح اُسے اور ریشماں کو مارا تھا کہ سارا جسم دکھ رہا تھا ۔ جب وہ ایک چارپائی پڑی ہوئی رو رہی تھی اسے اپنی مصیبت نہیں، باپ کی موت رُلا رہی تھی ۔ آخری بار باپ سے لپٹ کر رونے کی حسرت رہ گئی تھی ۔ بدنصیبی نے کس طرح چاروں طرف سے گھیرا تھا ۔ پہلے ساجے کا ساتھ چھوٹا ۔ پھر باپ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ایک مائی خیراں کا سایہ تھا ۔ اسے بھی ظالموں نے کسی دوسرے کمرے میں بند کر رکھا تھا ۔ وہ عجیب بے کسی کے عالم میں تھی ۔ کوئی اس کا یار و مددگار نہ تھا ۔

اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا ساجے کہاں ہیں اور کس حال میں ہے ۔ اس بے کسی کی حالت میں بھی اس کے دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ ساجے پر کوئی آنچ نہ آئے ۔

پھر ساجے کے ساتھ ہی اسے ریشماں کا خیال آیا ۔ پہلے ریشماں کے خیال سے اسے تکلیف ہوتی تھی ۔ اس کے محبوب کو چھیننے والی عورت سے وہ نفرت ہی کر سکتی تھی ۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں نفرت پیدا نہ ہو سکی ۔ وہ ہزار دشمن سہی ۔ پھر بھی اس نے اپنے باپ اور ماموں سے

اسے بچانے کی کوشش کی تھی ـــ شادو کی حفاظت کے لئے ساجد نہیں تھا مگر اس نے ساجد کی جگہ کو پُر کرنے کی جدوجہد کی تھی۔

شادو، جناب علی کی بیٹی سے نفرت کر سکتی تھی۔ لیکن ساجے کی وفادار بیوی سے نفرت نہ کر سکی ـــ اب وہ ریشماں کے متعلق سوچنے لگی کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ وہ اپنے گھر میں، اپنے ماں باپ کے سائے میں رہ کر بھی تنہا اور بے آسرا تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے باپ نے اسے بھی کسی کمرے میں قید کر دیا ہو۔

شادو چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کھڑکی کے پاس آ کر سلاخوں کے باہر دیکھنے لگی ـــ باہر برآمدے میں جلنے والی لالٹین کی روشنی کھڑکی کے ذریعہ کمرے کے اندر اندھیرے کو کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی برآمدے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دور ایک لالٹین چھت کی کڑی سے لٹک رہی تھی۔ نہ جانے کتنی رات ہو گئی تھی۔ شادو کو وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اسے حویلی کے ویران حصے میں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ اس حصے میں اناج کا ذخیرہ ہوتا تھا یا پھر حویلی کے ٹوٹے پھوٹے سامان کباڑ کی صورت میں جمع رہتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد رات کی خاموشی میں قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی شادو نے دیکھا ـــ دور لالٹین کی روشنی میں جناب علی اور برکتے آتے ہوئے

دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شراب کے نشے میں لڑکھڑا رہے تھے۔ شادو کھڑکی سے ذرا ہٹ کر اندھیرے میں آ گئی۔

جناب علی نے برکتے کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"جا برکتے! شادو تیرا انعام ہے۔ مگر ذرا جلدی آ جانا ـــ مجھے یقین ہے کہ ساجے اس حویلی میں ضرور آنے کی کوشش کرے گا۔"

"آتا ہے تو آنے دو۔ اگر اس نے تمہیں نقصان پہنچانا چاہا تو تم خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ میں اس کے استقبال کے لئے یہاں چھپا رہوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" جناب علی یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ برکتے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا شادو کے کمرے کی جانب آنے لگا۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

برکتے کے شانے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ ساجے کے خوف سے وہ اب ہمیشہ مسلح رہتے تھے۔ اس نے دروازے کے قریب آ کر شراب کی بوتل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیا اور جیب سے چابی نکال کر تالا کھولنے لگا۔

شادو جلدی سے دروازے کے پیچھے چلی گئی۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی برکتے کے ساتھ اندر آنے لگی۔ وہ نشیلی آنکھوں سے جھومتے ہوئے اندھیرے میں چارپائی کی

طرف دیکھنے لگا۔ شادو بہت دیر سے اندھیرے میں تھی۔ اس لئے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ برکتے روشنی سے آرہا تھا۔ اس لئے تاریکی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس نے آگے بڑھنے سے پہلے شراب کے دو گھونٹ پینا بہت ضروری سمجھا۔ بوتل کو بائیں ہاتھ سے لے کر دائیں ہاتھ میں لے کر اس نے منہ سے لگایا۔ اور مرغے کی طرح گردن اٹھا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ اسی وقت شادو نے دروازے کے کھلے ہوئے پٹ کو ایک دھڑاکے سے اس پر مارا — برکتے پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا۔ اس ناگہانی حملے سے سنبھل نہ سکا۔ بوتل ہاتھ سے نکل کر ایک طرف گئی اور وہ دوسری طرف جا کر گر پڑا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ شاید اندھیرے میں اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔

"سور کی بچی —" وہ چیخ کر بولا اور اندھیرے میں اسے تلاش کرنے لگا۔

شادو نے بوتل زمین سے اٹھا کر دروازے کو جلدی سے بند کر دیا۔ کمرے کی تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی۔ برکتے نے سمجھ لیا کہ وہ دروازے کے پاس ہے۔ وہ غراتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اسی وقت شادو نے پوری قوت سے بوتل کو اس کے سر پہ مار دیا — برکتے کو ایسا ہی لگا جیسے اس

کی کھوپڑی ٹوٹ کر بکھر گئی ہو۔ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ بوتل کی ٹوٹی ہوئی گردن شادو کے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ آگے کی طرف جھک کر زمین پر گرتا، شادو نے اس ٹوٹی ہوئی گردن کو اس کے منہ پر طمانچہ کی طرح جڑ دیا — ایک کریہہ سی دم توڑتی ہوئی آواز اس کے حلق سے نکلی اور وہ الٹ کر زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔

شادو اس کے سر کی جانب آ گئی تاکہ اس کے اٹھتے ہی پھر ایک بار حملہ کرے۔ لیکن وہ اٹھ نہ سکا۔

شادو کو خود اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ اس نے جنون کی حالت میں کتنا شدید حملہ کیا ہے۔ برکتے کا سر اور چہرہ خون سے تر ہو گیا تھا۔ بائیں آنکھ کے قریب ٹوٹی ہوئی بوتل کا گہرا زخم آیا تھا۔ وہ زمین پر پڑا اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ اب بھی اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ لیکن اٹھنے سے گھبرا رہا تھا کہ۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ شادو کس طرف ہے اور آئندہ حملہ کس انداز میں کرے گی۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے سر کی جانب جھک رہی تھی۔ اندھیرے میں برکتے کی سانسوں سے اندازہ لگایا کہ شانہ کس طرف ہے — پھر اس کا ہاتھ اٹھا اور ٹوٹی ہوئی بوتل پوری قوت سے اس کے چہرے پر آ کر

کھب گئی

برکتے کے منہ سے آخری چیخ نکلی اور وہ مچھلی کی طرح پھر پھڑانے لگا۔

شادو نے ٹٹول کر رائفل اس کے شانے سے کھینچ لی۔ پھر وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

"میرے باپ کے قاتل — میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے رائفل کی نال کو اس کے سینے پر رکھ کر دبانا چاہا —

اسی وقت کہیں سے جناب علی کی آواز آئی۔

"برکتے — ! کیا ہو گیا — ؟ تم کیوں چیخ رہے ہو...."

شادو دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی اور دور سے آنے والے جناب علی پر ایک فائر جھونک دیا — اس کا نشانہ سچا نہیں تھا۔ پھر بھی اس ناگہانی حملہ سے جناب علی بوکھلا کر دور اندھیرے میں چلا گیا۔

وہ غصہ سے چیخ کر بولا۔

"رائفل پھینک دے شادو ! میں نے تجھے دیکھ لیا ہے۔"

"ابھی دیکھا کہاں ہے۔ اب دیکھے گا...." شادو نے کمرے کے دروازے کو پوری طرح کھول دیا۔

اب روشنی میں برکتے پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کمر سے کارتوس

کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ قریب آ کر کارتوس کی پیٹی کھولنے لگی۔ وہاں سے وہ حصہ نظر آ رہا تھا جہاں جناب علی اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ اسے کمرے میں جاتے دیکھ کر وہ تاریکی سے باہر آیا۔ شادو نے کہا۔

"ابھی بندوق میں دوسرا کارتوس باقی ہے...."

جناب علی اچھل کر پھر اندھیرے میں چلا گیا۔

شادو نے کارتوس کی پیٹی اپنے شانے سے لٹکا لی اور رائفل کی میگزین کو دوبارہ لوڈ کرتے ہوئے بولی۔

"ادھر گولی چلانے کی حماقت نہ کرنا۔ وہ گولی تیرے برکتے کو بھی لگ سکتی ہے۔"

"برکتے کہاں ہے —؟" اس نے پوچھا۔

"وہ جہاں بھی ہے جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔" شادو نے جواب دیا۔

اتنے میں جناب علی کا آدمی دوڑتا ہوا وہاں آیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے — ؟ ہم نے ابھی گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔"

پاس والے کمرے سے مائی خیراں کی آواز آئی۔

"نی شادو — ایک سے دو ہو گئے۔ تو کہاں تک مقابلہ کرے گی۔"

شادو نے اطمینان سے کہا۔

" گھبرایئے نہیں ماں جی ___ ایسے بھی مرنا ہے، ویسے بھی مرنا ہے پھر کیوں نہ عزت کی موت کو گلے لگایا جائے۔"

جناب علی کے آدمی نے کہا۔

" شادو! اپنی خیریت چاہتی ہے تو رائفل پھینک کر سامنے آجا....!"

" آرہی ہوں ___ !" شادو نے رائفل اٹھا کر لالٹین کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ لالٹین کی چمنی ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی ___ چاروں طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی کمرے کے باہر آئی۔ دروازے کو بند کر کے کنڈی چڑھائی اور اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی اناج کی بوریوں کے پیچھے چلی گئی۔

اب اس کے ایک طرف وہ کمرہ تھا، جہاں مائی خیراں قید کی گئی تھی۔ دوسرے کمرے میں برکتے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی کمرے سے باہر نہیں آسکتا تھا۔ کیونکہ دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی ___ دوسری طرف وہ بوریوں کے اوپر سے دشمنوں کی نقل و حرکت کو دیکھ سکتی تھی۔ حالانکہ اس وقت گہری تاریکی میں ایک دوسرے کو دیکھنا ناممکن تھا۔ لیکن کمروں کے سامنے برآمدہ ایسا تھا کہ دشمن کو سامنے سے ہی آنا پڑتا تھا اور اس اندھیرے میں کس کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ

شادو کے بالکل سامنے آسکتا۔

جناب علی کی آواز تاریکی میں ابھری۔

" شادو ___ میں جانتا ہوں کہ برکتے کے پاس صرف دس کارتوس تھے دو کارتوس تو ضائع کر چکی ہے۔ باقی آٹھ کب تک تیرے کام آئیں گے؟"

" جب تک ساجے نہیں آجاتا۔ یہ میرے لئے بہت ہیں۔" شادو نے جواب دیا۔

وہ غصہ سے بولا۔

" ساجے کی لاش ہی تیرے پاس آئے گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک فائر کیا۔ اندھیرے میں ایک ذرا سا شعلہ بھڑکا اور گولی آٹے کی بوریوں میں آکر پیوست ہو گئی۔

شادو نے جوابی فائر نہیں کیا۔ وہ کارتوس کو سنبھال کر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے خاموشی سے کھڑی ہوئی اندھیرے میں گھورتی رہی۔

جناب علی نے چیخ کر کہا۔

" تو کہاں ہے ___ فائر کیوں نہیں کرتی ___ اے سور کی بچی.....!"

وہ خاموش رہی۔

" یاد رکھ اگر برکتے کو کچھ ہو گیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی زندگی چاہتی ہے تو اسے میرے حوالے کر دے۔"

جناب علی اسے باتوں میں الجھا رہا تھا اور اس کا آدمی فرش پہ پڑا ہوا آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے مائی خیراں کے کمرے کی جانب آ رہا تھا۔ تاکہ کمرہ کھول کر اور مائی خیراں کو رائفل کی زد میں رکھکر شادو کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دے۔

وہ جناب علی کی باتیں سن رہی تھی اور اندھیرے میں گھورتی جا رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے کالی رات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فرش پر رینگنے والا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے فرش پر گھسٹتا ہوا کمرے کے قریب آ گیا۔ اس کے دانتوں میں کمرے کی چابی تھی۔ رائفل کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ اتنی دور تک وہ کہنیوں کے بل رینگتا ہوا آیا تھا

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے بڑی آہستگی سے رائفل رکھا۔ اور منہ سے چابی نکال کر اپنا ہاتھ تالے کی طرف بڑھانے لگا — ہاتھ وہاں تک پہنچا۔ مگر چابی کو تالے کا سوراخ نہیں مل رہا تھا۔

اس نے گھٹنے کے بل اٹھ کر تالے کو دوسرے ہاتھ سے تھامنا چاہا۔ تالا دروازے سے ٹکرا گیا۔ رات کے سناٹے میں "کھٹ" کی آواز ہوتے ہی شادو چونک کر چیختی ہوئی بولی۔

"ماں جی — تم دروازے کے پاس ہو؟"

"نہیں — " اندر کمرے سے مائی خیراں کی آواز آئی۔

مائی خیراں کی "نہیں" سنتے ہی شادو نے دروازے پر گولی چلا دی۔ ایک شعلہ لپکا اور تالا کھولنے والا چیخ مار کر الٹ گیا۔ پھر وہ کراہتا ہوا واپس بھاگنے لگا۔

شادو گونجتی گرجتی ہوئی آواز میں بولی۔

"جناب علی — ! برکتے کے بعد یہ دوسرا آدمی ہے۔ اب تیسرے کو بھیج دے — پھر نہ کہنا کہ میں گولیاں ضائع کر رہی ہوں۔۔۔"

دوسری طرف خاموشی رہی۔

جناب علی کو یقین ہو گیا کہ شادو کا محاذ صبح سے پہلے نہیں ٹوٹے گا۔

عیب اپنا ہو یا پرایا۔ وہ زبان
پر آہی جاتا ہے۔ آج ماں کی زبان
پر بیٹی کا عیب آگیا تھا۔

شادو کی پہلی فائرنگ کی آواز سُنتے ہی ریشماں اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ لیکن اس کی ماں اور ملازم اسے پکڑ کر پھر کمرے میں لے گئے۔

وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی ہوئی بولی۔

"مجھے جانے دو، شادو کو کچھ ہو گیا تو میں ساجے کو منہ نہیں دکھا سکوں گی۔"

"چپ چاپ اس کمرے میں پڑی رہ — !" اس کی ماں نے کہا۔ "تو ساجے کے لئے اپنے باپ کے دشمنوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ تجھے شرم نہیں آئی۔ کیا اسی دن کے لئے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا۔"

وہ روتی ہوئی بولی۔

"ابا اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ساجے سے دشمنی کر رہے ہیں۔ کیا تم بھی یہی چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی کا سہاگ لٹ جائے؟"

"بیوقوف لڑکی — تو صرف اپنے سہاگ کو دیکھتی ہے۔ تجھے باپ کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ تو اپنے دو دن کے سہاگ کی خاطر میرے برسوں کے سہاگ کو اجاڑ دینا چاہتی ہے۔ کیا یہ خود غرضی نہیں ہے؟"

ریشماں نے جواب دیا۔

"ہم دونوں ہی خود غرض ہیں۔ میں ساجے کے لئے ابا کی مخالفت کر رہی ہوں اور تم ابا کے لئے ساجے سے دشمنی کر رہی ہو۔ زندگی کے اس موڑ پر آکر ہم ماں بیٹی نہ رہیں۔ صرف دو خود غرض عورتیں بن گئی ہیں جنہیں صرف اپنا اپنا سہاگ عزیز ہوتا ہے۔"

اس کی ماں گھور کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں — تو ٹھیک کہتی ہے۔ ماں اپنی اولاد کے لئے جان دے سکتی ہے لیکن اپنے خاوند کی تباہی برداشت نہیں کر سکتی۔"

ریشماں نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بیٹی بھی اپنے والدین کے لئے جان دے سکتی ہے۔ لیکن اپنے مجازی خدا سے غداری نہیں کر سکتی۔"

"بڑی آئی مجازی خدا بنانے والی — تیرے جیسی بے شرم اور بے حیا لڑکی کے لئے کیا مردوں کی کمی ہے؟ اری یہ تو ہمارا احسان ہے کہ ہم نے تجھے بدنامی سے بچا لیا۔ ورنہ دنیا والے تیرے چہرے کی کالک دیکھ کر تجھ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔

"ہاں امی — میں بہت بری عورت ہوں۔ میرے چہرے کی کالک کبھی نہیں چھپ سکتی کیونکہ خود غرضی کے وقت یہ کالک ماں کی زبان پر آ جاتی ہے۔ دنیا مجھے بدنام کرے یا نہ کرے تم تو کر رہی ہو۔"

"اری بدنام کرنا ہوتا تو کب کا دھکے دے کر تجھے گھر سے نکال دیتی۔ مگر کیا کروں اس میں اپنی بھی بدنامی ہے۔ ہائے، میرے تو نصیب پھوٹ چکے ہیں۔ ایک طرف خاوند کے عیبوں کو چھپانا پڑتا ہے تو دوسری طرف بیٹی کے عیبوں پر پردہ ڈالنا پڑتا ہے۔ ان کی حمایت کرتی ہوں تو تو مجھے خود غرض کہتی ہے۔ تیری حمایت کرتی ہوں تو ان کی تباہی دیکھی نہیں جاتی — تجھے میری مجبوریوں کا احساس ہے تو بتا میں کیا کروں؟"

"جو انصاف کا تقاضا ہے وہی کرو!" ریشماں نے کہا۔

اس کی ماں نے جواب دیا۔

"انصاف کا تقاضا تو یہی تھا کہ ساجے کی شادی شاد سے ہوتی۔ پھر تو نے ناانصافی کیوں کی —؟"

وہ لاجواب ہو کر ماں کے چہرے کو تکنے لگی۔ ماں نے کہا۔

" کوئی محبت کو جبراً حاصل کرنے کے لئے ناانصافی کرتی ہے۔ کوئی دولت کو حاصل کرنے کے لئے بے ایمانی کرتا ہے۔ کوئی اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنے کے لئے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ناانصافی اور بے ایمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ تم نے شادو پر ظلم کیا تو وہ ظلم نہیں تھا آج وہی ساجے تم سے چھینا جا رہا ہے تو تمہیں ظلم کا احساس ہو رہا ہے۔۔۔"

ریشماں کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اب واقعی اسے احساس ہو رہا تھا کہ کسی کی محبت کو چھین لینا کتنا بڑا گناہ ہے۔ آج صرف شادو مظلوم نہیں تھی۔ وہ خود بھی مظلوم تھی۔ خود اس کا باپ اس کے ساجے کو ہمیشہ کے لئے چھین لینا چاہتا تھا۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگے کہ اس پر ہونے والے ظلم کا خاتمہ ہو جائے۔۔ لیکن یہی دعا شادو بھی مانگتی ہو گی۔۔ خدا کس کی دعا قبول کرے گا۔۔ ؟

انسان دوسروں پر ظلم کرتا ہے اور خود ہی مظلوم بن کر دعا مانگتا ہے۔ دعا قبول نہ ہو تو خدا کی رحمت سے انکار کرتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی غلطیوں کو سمجھتے ہیں اور خود ہی اپنی غلطیوں کی تلافی کرتے ہیں۔ کم از کم ریشماں اس وقت اپنی غلطی کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ لیکن اس کی تلافی کسی

طرح ہو گی۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر گر پڑی۔

اس کی ماں اور ملازم کمرے سے باہر چلے گئے۔

" اتنی بڑی غلطی کی تلافی کس طرح ہو گی۔۔ ؟" اس کے دل نے پوچھا۔

کسی کے سپنوں میں گونجنے والی شہنائی کو چرانا آسان ہے۔ مگر چرائی ہوئی چیز کو واپس کرنا مشکل ہے۔ عورت اپنا سب کچھ دے سکتی ہے مگر اپنا خاوند نہیں دے سکتی۔۔ اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے ؟ ماں نے اگر طعنہ دیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ساجے سے منہ موڑ لے۔ ساجے تو اب زندگی کی ہر سانس میں رچ بس گیا تھا۔

ویسے ماں کی بات ایک پھانس کی طرح دل میں چبھی ہوئی تھی۔۔ وہ پھانس نکالے نہیں نکل رہی تھی۔ عیب اپنا ہو یا پرایا۔ وہ زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ آج ماں کی زبان پر بیٹی کا عیب آ گیا تھا۔ کل ساجے بھی یہی طعنہ دے سکتا تھا۔ حالانکہ وہ اب تک ایک بہت ہی محبت کرنے والا خاوند ثابت ہوا تھا۔ مگر کبھی کسی غصّہ کی حالت میں سچی بات طعنہ بن کر زبان پر آ جاتی ہے اور وہ اس سچائی سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے بے ایمانی سے ساجے کو حاصل کیا ہے۔

وہ کرسی سے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

اسی وقت پھر فائرنگ کی آواز آئی۔ ساتھ ہی شادو کی آواز بھی دور حویلی کے ویران حصے سے سنائی دے رہی تھی۔ واضح طور سے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ریشماں اسے صرف آواز سے ہی پہچان رہی تھی۔

یک بیک اس کے دل میں خیال آیا کہ مجھ پر جو داغ لگ چکا ہے۔ میں اسے مٹا سکتی ہوں۔ شادو کی حفاظت کر کے ساجے کے دل میں یہ بات نقش کر سکتی ہوں کہ میں نے اپنی عزت کا پاس نہیں کیا۔ لیکن شادو کی عزت کو دشمنوں سے بچانے کی کوشش ضرور کرتی رہی ہوں۔ میرے چہرے پر کالک ہی سہی۔ مگر میں نے شادو کو داغدار ہونے سے بچایا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ کمرے سے باہر نکلنے کے لئے دروازے تک آئی ۔ لیکن دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔

"دروازہ کھولو ۔ ! " وہ دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔

"خاموش رہو ۔ ! " باہر سے ماں کی آواز آئی۔ "اس کمینی شادو نے تیرے ماما کو زخمی کر کے کمرے میں بند کر دیا ہے اور اب تیرے ابا پر گولیاں چلا رہی ہے۔ خدا اسے غارت کرے ...."

ریشماں حیرت سے شادو کے متعلق سوچنے لگی۔ پھر اس نے دروازے

لرپیٹ کر کہا۔

"اللہ کرے ماما مرجائے ۔ اللہ کرے کہ ابا مرجائیں ...."

اس کی ماں نے چیخ کر کہا۔

"میں تیری زبان کھینچ لوں گی۔ اپنے باپ کے لئے اور ماما کے لئے بددعا کرنے سے پہلے خود کیوں نہیں مرجاتی ۔ ؟"

وہ قہقہہ لگاتی ہوئی بولی۔

"مجھے مارنے سے پہلے ماما کی خبر لو ۔ اس نے شادو کے باپ کو مارا تھا ۔ اب شادو اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"ہائے ربا ! میں کیا کروں ۔ برکتے کو کس طرح بچاؤں ۔ ۔ ۔ ۔" اس کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

ریشماں دروازے کے پاس سے پلٹ کر سوچنے لگی اور سوچ سوچ کر کڑھنے لگی کہ وہ کتنی مجبور اور بے بس ہو گئی ہے۔ اپنے ہی گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ جبکہ باہر سے آنے والی شادو یہاں قیدی بن کر نہ رہ سکی۔ اس نے اپنی آزادی کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اور اب وہ دشمنوں سے تنہا لڑ رہی تھی۔

ریشماں کو اپنی کمزوری پر رونا آگیا۔ حویلی اور جھونپڑی میں رہنے والی دونوں عورتوں میں یہی فرق تھا۔ حویلی کی آرام دہ اور پُرلطف زندگی نے ریشماں میں ایسی نزاکت پیدا کر دی تھی۔ کہ وہ مصیبتوں کے وقت صرف آنسو ہی بہا

سکتی تھی ۔ اس کے برعکس سردی، گرمی اور بارش کے وقت کھیتوں میں کام کرنے والی شادو حالات سے لڑنا اور مصیبتوں کا منہ موڑنا جانتی تھی ۔

وہ اپنی نااہلی پہ جھنجھلانے لگی ۔ اس وقت کے متعلق سوچنے لگی ۔ جب ساجے یہاں آئے گا ۔ اپنی محبوبہ کو لڑتے اور اپنی بیوی کو روتے دیکھیگا ہو سکتا ہے کہ وہ اسے طعنے بھی دے ۔ نفرت بھی کرے ـــ اور وہ نفرت کرنے میں حق بجانب ہوگا ۔ کیونکہ وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ اپنے گھر میں شادو کی حفاظت کر سکے اور اس کی بوڑھی ماں کو ایک وقت کی روٹی کھلا سکے ۔

وہ پلنگ پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی ۔ وہ جانتی تھی کہ رونے سے بگڑی ہوئی بات نہیں بنتی ۔ ساجے کے دل میں جگہ بنانے کے لئے اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا ۔ شادو اور مائی خیراں کے کسی کام آنا ضروری تھا ۔ مگر وہ اس بند کمرے میں رہ کر کیا کر سکتی تھی ـــ ؟ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی ۔ صرف سوچ سکتی تھی ۔ لیکن اپنی سوچ پر عمل نہیں کر سکتی تھی ۔

روتے روتے اس کی نظریں ساجے کے سامان پہ پڑ گئیں ۔ نکاح کے دن مائی خیراں نے اس کا تمام سامان یہاں بھیج دیا تھا ـــ ریشماں اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ ساجے کے سامان میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنا چاہیئے جو اسے کمرے سے نکلنے میں مدد دے سکے ۔

وہ قریب آ کر ایک ایک سامان کی تلاشی لینے لگی ۔

اس کے سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ پھولدار ریشمی کپڑے بھی تھے اور یہ تمام نئے کپڑے وہ شادو کے لئے کراچی سے لایا تھا ۔ کیونکہ وہی اس کی دلہن بننے والی تھی ۔ ان رنگین کپڑوں سے ساجے کے ان رنگین خیالات و جذبات کا پتہ چلتا تھا جو صرف شادو کے لئے تھے ـــ شادو اس کی نہ بن سکی تھی ۔ لیکن ریشماں جانتی تھی کہ ساجے کے دل میں اب بھی وہی لڑکی بسی ہوئی ہے ۔ حالانکہ اس نے ریشماں کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا ۔ مگر وہ جانتی تھی ۔ محبت کرنے والے پیار کے جذبوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ جس طرح وہ ساجے کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی ۔ اسی طرح ساجے ساجے، شادو کو اور شادو، ساجے کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی ۔

وہ ایک گہری سانس لے کر دوسرے کپڑوں کی تہہ میں دیکھنے لگی ۔ سوٹ کیس کے ایک گوشے میں ایک چاقو رکھا ہوا تھا ـــ ڈوبنے والے کے لئے تنکے کا سہارا ہوتا ہے ۔ اس نے چاقو کو اٹھا کر مٹھی میں بھینچ لیا ۔

اس وقت وہ محض چاقو کا دستہ نہیں تھا ۔ ساجے کے کسی بھی دشمن کی گردن تھی جو اس کی مٹھی میں جکڑی ہوئی تھی ۔

ماموں کے بیچ وخم میں بھٹکتے رہے
شمیم ایک بے وفا کے نقش قدم چھوٹنے
کے بعد یہ بھی تو کم نہیں تیرا در چھوٹنے
کے بعد انسان بن گیا ہوں میں دل
ٹوٹنے کے بعد۔

صبح کا اُجالا اچھی طرح پھیل گیا تھا۔
شادو اپنے اطراف بوریوں کی دیوار بنائے، ہاتھوں میں رائفل لئے
بیٹھی ہوئی تھی جس رات کو سیلاب آیا تھا۔ اس رات سے وہ سو نہ سکی
تھی۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اسے سونے کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ سیلاب
کی رات وہ لیے بھی تمام پنڈ کے لوگ جاگتے رہے تھے۔ دوسری صبح
بالو اور ناصرہ کے اغوا کا معاملہ اتنی سنگین صورت اختیار کر گیا تھا
کہ ساجے کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی ـــــ ساجے خطرے میں ہو اور
وہ سو جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ اس کے انتظار میں
جاگتی رہی۔

پھر شام ہوتے ہی برکتے اسے اور مائی خیراں کو پکڑ کر اس حویلی میں لے آیا تھا۔ اس وقت باپ کی موت کا صدمہ ایسا تھا، کہ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ پھر یہ پریشانی بھی کم نہیں تھی کہ جناب علی اسے حراست میں رکھ کر ساجے کو حویلی میں آنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اور برکتے تو اس کی عزت کا ہی دشمن بن کر چلا آیا تھا۔ پے در پے ایسی ایسی مصیبتیں نازل ہوتی رہی تھیں کہ اسے اونگھنے یا پلک جھپکنے کا موقعہ بھی نہیں ملا تھا۔

اب چھبیس ۲۶ گھنٹے گزر گئے تھے اور نیند اس پر بُری طرح حاوی ہو رہی تھی۔

وہ اپنے آپ کو پورے ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی اونگھتے ہوئے سر جھکنے لگتا تو وہ جلدی سے چونک کر پھر رائفل کو مضبوطی سے پکڑ لیتی اور گھبرا کر دور برآمدے کے آخری سرے کی جانب دیکھنے لگتی۔ جہاں جناب علی کا ایک آدمی رائفل لئے اس کی تاک میں کھڑا تھا۔

صرف نیند کا غلبہ نہیں تھا، بھوک بھی پریشان کر رہی تھی۔ پچھلے دن دوپہر کو اس نے ایک روٹی کھائی تھی اور ایک گلاس پانی پیا تھا — اس وقت بھوک سے زیادہ پیاس ستا رہی تھی

اس کا حلق سوکھتا جا رہا تھا۔ حویلی میں پانی کا اتنا ذخیرہ تھا کہ ایک ہفتہ تک دس آدمیوں کی پیاس بجھائی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ دشمنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں مانگ سکتی تھی۔

مصیبت تنہا نہیں آتی، اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آتی ہے کل رات برکتے اور اس کے آدمی اسے مارتے پیٹتے یہاں لائے تھے۔ اس وقت جسم کی چوٹوں کا احساس اتنا نہیں تھا۔ جتنا کہ اب ہو رہا تھا۔ ذہن پر نیند کا غلبہ ہو — پیٹ میں بھوک ہو — حلق میں پیاس کے کانٹے چبھتے ہوں اور جسم پر جا بجا چوٹوں کی وجہ سے درد تڑپاتا ہو تو اچھے سے اچھا حوصلہ رکھنے والا بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔

شاد و کمزور پڑ رہی تھی۔

"ساجے کہاں ہو — ؛ اب تو آ جاؤ . . . ." اس کا دل رونے لگا۔

اس کے جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اگر وہ سو جاتی تو درد بھی تھوڑی دیر کے لئے سو جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے نصیب بھی سو جاتے۔ جناب علی اس کی ٹکا بوٹی کر کے رکھ دیتا۔

تھوڑی دیر بعد جناب علی برآمدے کے آخری سرے پہ آیا۔ اور اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"شادو — جس کے انتظار میں تو بیٹھی ہے۔ وہ بزدل نکلا۔ معلوم ہوتا ہے کہیں منہ چھپا کر بھاگ گیا ہے۔ تو کب تک بھوکی پیاسی بیٹھی رہے گی؟"

شادو کے دل سے ایک آہ نکلی۔ وہ جواب دینے کی بجائے ساجد کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ گھبرا رہی تھی کہ ساجد کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ ضرور کوئی ایسی ہی بات تھی۔ ورنہ وہ یقیناً ان کی مدد کے لئے وہاں آتا — شادو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ساجد کے متعلق کہاں سے معلومات حاصل کرے۔ وہ بوریوں کے پیچھے سے اٹھ کر کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے اٹھتے ہی جناب علی کے آدمی گولی چلا دیتے۔

اب تو ان بوریوں کے درمیان ہی اونگھتے اونگھتے اسے سو جانا تھا اور یہیں مر کر دفن ہو جانا تھا۔ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے پہلے عزت جاتی، پھر جان چلی جاتی۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا، وہی مناسب تھا۔

جناب علی نے چیخ کر پوچھا۔

"تو خاموش کیوں ہے جواب کیوں نہیں دیتی — ؟"

وہ بدستور خاموش رہی۔ البتہ برکتے کے کراہنے کی آواز یہ

آنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا کھڑکی کے پاس آ گیا تھا، پھر اس نے کھڑکی کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر دور کھڑے ہوئے جناب علی کی طرف دیکھا اور بڑی کمزوری سے بولا۔

"پپ — پانی — پانی . . . !"

جناب علی اس کی حالت دیکھ لرز گیا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل کے حملے سے اس کے چہرے کا گوشت کٹ کر اُلٹ گیا تھا۔ لال لال بوٹی نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر خون سوکھ گیا تھا۔ بائیں آنکھ کے قریب زخم آنے کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ بند ہو گئی تھی اور وہ کانے دجال کی طرح صرف ایک آنکھ سے اپنے بہنوئی کو دیکھ رہا تھا۔

جناب علی نے غصّہ سے چیخ کر کہا۔

"شادو — میں تیری بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی —" شادو نے جواب دیا۔ "اس بندوق کی آخری گولی میں نے اپنے لئے رکھی ہے۔"

اسی وقت ریشماں کی ماں بھی وہاں آ گئی۔ اپنے بھائی کو اس بری طرح زخمی دیکھ کر وہ رونے لگی۔ برکتے نے گھگھیا کر کہا۔

"مم — مجھے بچاؤ — پانی — پانی دو . . . !"

ریشماں کی ماں تڑپ کر دوڑتی ہوئی بھائی کی طرف آنے لگی۔

شادو نے چیخ کر کہا۔

"رُک جاؤ ــــ!"

وہ نہیں رُکی ــــ بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ شادو نے اس کے پاؤں کے قریب فائر کر دیا۔

وہ بوکھلا کر گر پڑی اور اس طرح چیخنے لگی جیسے گولی لگ گئی ہو۔ جناب علی چیخ چیخ کر شادو کو گالیاں دے رہا تھا۔

شادو نے کہا۔

"ریشماں کی ماں ــــ دوسری گولی تیرے سینے کے پار ہو گی ــــ اپنی زندگی چاہتی ہے تو واپس چلی جاؤ . . . ."

ریشماں کی ماں فرش پہ گھسٹتی ہوئی تھوڑی دور تک گئی۔ پھر اُٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس چلی گئی اور رو رو کر کہنے لگی۔

"نی شادو ــــ ایسا ظلم نہ کر ــــ میرا بھائی مر جائے گا۔"

"میرے باپ کو مارنے والا اسی طرح تڑپ تڑپ کر مرے گا۔"

"خدا کے لئے اسے معاف کر دے۔ میں ہاتھ جوڑ کر تجھ سے معافی مانگتی ہوں۔"

پھر وہ جناب علی کو جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔

"تم خاموش کیوں کھڑے ہو۔ میرا بھائی ہمیشہ تمہارے لئے اپنی جان

بازی لگاتا رہا ــــ اب وہ مر رہا ہے تو تم تماشہ دیکھ رہے ہو۔"

جناب علی عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ دو پہ گولیاں برسا کر بھی وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس نے ست خوردہ انداز میں کہا۔

"شادو ــــ تو اور تیری مائی خیراں بھی بھوک کی پیاسی ہے۔ مجھے کتے کو ایک گلاس پانی پلانے دے۔ اس کے بدلے میں تم دونوں کو انا اور پانی دوں گا۔"

شادو کی بھوک بڑھ گئی۔ پیاس کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا۔ پھر اُسے مائی خیراں کا بھی خیال تھا کہ وہ بوڑھی عورت زیادہ دیر ہو کی پیاسی نہیں رہ سکیگی۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد بولی۔

"میں اتنی معمولی شرط پر کتے کو پانی نہیں پینے دوں گی۔ میرا طالبہ کچھ اور بھی ہے۔"

"کیا ہے تیرا مطالبہ ــــ؟"

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

"روٹی اور پانی کے علاوہ بیس عدد کارتوس اور ایک بندوق۔۔!"

"یہ نہیں ہو سکتا ــــ" وہ بگڑ کر بولا۔

"تو پھر اپنے سالے کو مرنے دے۔"

"نہیں ۔۔۔!" ریشماں کی ماں چیخ کر بولی۔ "وہ نہیں مر سکتا ۔۔۔ وہ نہیں مر سکتا ۔۔۔ تُو جو چاہے گی، وہ تجھے مل جائے گا۔"

برکتے نے سلاخوں کو مضبوطی سے تھام کر کانپتے ہوئے کہا۔

"اس کی بات مان لو ۔۔۔ مجھے کسی طرح بچاؤ ۔۔۔ میرے زخموں میں کانچ کے ٹکڑے چبھ رہے ہیں ۔۔۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی ۔۔۔ خدا کے لئے ڈاکٹر سلام کو بلا کر لاؤ . . ."

شادو نے چیخ کر کہا۔

"ڈاکٹر یہاں نہیں آئے گا۔"

جناب علی نے غصّہ سے کہا۔

"بکواس مت کر ۔۔۔ ڈاکٹر کو بلانا بہت ضروری ہے وہ صرف پانی پی کر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

شادو دانت پیس کر بولی۔

"میں صرف اس لئے اسے پانی دینا چاہتی ہوں کہ وہ تھوڑی دیر تک زندہ رہ کر اور تڑپتا رہے۔ اسے یہ تو معلوم ہونے دو کہ زندگی کتنی قیمتی ہوتی ہے۔"

"پپ ۔۔۔ پانی ۔۔۔ پہلے پانی ہی پلا دو . . . ." برکتے عاجزی

سے کہنے لگا۔

"اچھی بات ہے۔" جناب علی نے شادو سے کہا۔ "میرا آدمی روٹی پانی، بندوق اور کارتوس لے کر آ رہا ہے۔"

"نہیں ۔۔۔!" شادو چیخ کر بولی ۔۔۔ "تیرا کوئی بھی آدمی اِدھر آیا تو زندہ واپس نہیں جائے گا ۔۔۔ یہاں صرف ریشماں آ سکے گی۔"

ریشماں کی ماں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہاں، جیسا کہ تم کہو گی، ویسا ہی ہوگا۔ میں ابھی ریشماں کو بلا کر لاتی ہوں۔"

وہ وہاں سے گھوم کر چلی گئی۔

جناب علی غرا کر شادو کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی پلٹ کر جانے لگا۔

شادو نے کہا۔

"ٹھہر جا ۔۔۔ جناب علی ۔۔۔ ہمارے کھانے میں زہر بھی ملایا جا سکتا ہے۔ تیرا یہاں سے جانا مناسب نہیں ہے۔"

جناب علی جہاں تھا، وہاں مٹھیاں بھینچ کر کھڑا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ریشماں ایک ٹرے میں سالن اور روٹیوں کی پلیٹیں ایک جگ پانی اور دو گلاس رکھ کر وہاں آگئی۔ وہ بہت خوش

نظر آرہی تھی اور شادو کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

جناب علی نے بیس عدد کارتوس گن کر ٹرے پہ رکھ دیئے۔ اور ریشماں کے شانہ پہ ایک رائفل لٹکا دی — شادو نے کہا۔

"ریشماں — اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ یہاں آنے وقت اور یہاں سے جاتے وقت دیوار سے لگ کر آنا۔ تاکہ دشمن ہمیشہ میرے نشانے پر رہیں — چل آجا ....!"

ریشماں اس کی ہدایت پہ عمل کرتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اور ٹرے کو ایک بوری پہ رکھ کر بڑی حسرت سے بولی۔

"شادو —! تو عورت نہیں — سپاہی ہے ...."

"سپاہی —!" شادو کا دل اندر سے دھڑکنے لگا — سپاہی — میرے سپاہی کہاں ہے تو —؟"

پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"میں — میں کچھ بھی نہیں ہوں — ہاں مگر تو سپاہی کی بیوی ہے تجھے اتنا معلوم ہونا چاہیئے کہ تیرا سپاہی کہاں چلا گیا ہے —"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ میں انہیں تلاش بھی نہیں کر سکتی۔ سچ کہتی ہوں شادو — تیری طرح میں بھی اس حویلی میں قید ہو کر رہ گئی ہوں —"

ریشماں کی ماں دور سے چیخ کر بولی۔

"اری پہلے اپنے ماما کو پانی پلا دے۔ پھر باتیں کرتی رہنا ..."

شادو نے ٹرے سے تمام کارتوس اٹھا کر اپنے پاس رکھ لئے اور اس کے شانے سے رائفل اتار کر اس میں کارتوس بھرنے لگی۔ ریشماں ایک پلیٹ میں سالن اور روٹیاں رکھ کر جانے لگی تو شادو نے کہا۔

"پہلے مجھے دو گھونٹ پانی پلا دے ...."

ریشماں کی ماں اور جناب علی غراتے ہوئے دیکھ رہے تھے — ان کی بیٹی پہلے شادو کو پانی پلا رہی تھی۔ پھر وہ مائی خیراں کے کمرے میں جا کر اسے روٹیاں دے رہی تھی۔ آخر میں وہ برکتے کے پاس گئی۔

"کیوں ماما —؟" اس نے پوچھا — "تم اپنے ہی جال میں کیسے پھنس گئے ؟"

"پہلے مجھے پانی دے —!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

ریشماں نے شادو سے پوچھا۔

"کیوں شادو — تو نے ماما کو یہاں کس طرح قید کر دیا ہے —؟"

شادو نے جواب دیا۔

"یہ ہوس میں اندھا ہو کر یہاں آیا تھا۔ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ اب میں اس کی زندگی سے کھیل رہی ہوں۔"

ریشماں جگ کو اٹھا کر گلاس میں پانی کی دھار انڈیلنے لگی۔ برکتے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"ماما — پانی پیو گے — ؟"

"ہاں — جلدی — جلدی دے ۔ ۔ ۔ ۔ !" وہ سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ بڑھا کر پانی کے لئے ملپلانے لگا۔

ریشماں نے کہا۔

"کسی کی جان سے کھیلنا، کسی کی عزت سے کھیلنا، تمہارے لئے معمولی سی بات ہے — جان کس طرح جاتی ہے۔ عورت عزت سے کس طرح خالی ہوتی ہے جانتے ہو؟ ٹھیک اسی طرح، جس طرح کہ یہ گلاس پانی سے خالی ہوتا ہے یہ دیکھو ۔ ۔ ۔"

وہ گلاس کے پانی کو زمین پر گرانے لگی۔

وہ تڑپ کر سلاخوں کے باہر ہاتھ پھیلانے لگا۔

"پانی نہ پھینک — ریشماں تو میری بھانجی ہے — میری بیٹی ہے — ایک گھونٹ پلا دے ۔ ۔ ۔"

ریشماں کی ماں بھی چیخنے لگی۔

"اری او کمینی — بدذات — پانی کیوں پھینک رہی ہے اسے پلاتی کیوں نہیں؟"

جناب علی نے شادو سے کہا۔

"شادو — میں نے تیری شرط پوری کر دی۔ تجھے بھی اپنی شرط پورا کرنا چاہیئے۔"

شادو نے کہا۔

"ریشماں — میں زبان دے چکی ہوں — اسے پانی پلا دے۔"

ریشماں نے جواب دیا۔

"شادو — پہلے ماں جی اپنے کمرے سے نکل کر تیرے پاس آئے گی — تو اکیلی ہے — اور تھکی ہوئی ہے — تجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے — اس کے بعد میں حویلی کی چھت پر جاؤں گی اور لوگوں سے یہاں کا ایک ایک واقعہ بیان کروں گی — ہو سکتا ہے کہ کوئی میری بات کو ساجے تک پہنچا دے — اس کے بعد واپس آکر ماما کو پانی پلاؤں گی۔"

ریشماں کی ماں غصّہ سے بولی۔

"سّور۔ کمینی۔ کتّی۔ اپنے ماں باپ سے۔ اپنے ماما سے دشمنی کر رہی ہے۔ اسے پانی پلادے۔ ورنہ بہت بُرا ہوگا۔"

"بُرا کب نہیں ہو رہا ہے امی۔ تمہارا داؤ لگے گا۔ تو تم بدلا لے لینا۔ ابھی تو ہماری باری ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے مائی خیراں کو کمرے سے نکالا۔ اسے ثنادو کے پاس پہنچایا۔ پانی کے جگ اور گلاس کو بھی اس کے پاس رکھ دیا۔ پھر دیوار سے لگ کر واپس جانے لگی۔

اس کے ماں باپ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن فی الحال اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ابھی وہ پھر واپس جاکر برکتے کو پانی پلائے گی۔

اسی وقت باہر گھرر گھرر کی آواز گونجنے لگی۔

ایک ہیلی کاپٹر حویلی کی چھت پر سے گزر رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے دو چور کبھی ایکدوسرے کی مخالفت نہیں کرتے۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کیلئے ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہیلی کاپٹر پنڈ کے چاروں طرف چکر لگا رہا تھا۔

تمام لوگ اپنی اپنی چھتوں پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلانے لگے۔ اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر مدد کے لئے پکارنے لگے۔

دوسرے چکر پر ہیلی کوپٹر ذرا نیچے آ گیا۔ پھر اس میں سے پلاسٹک کے بھرے ہوئے تھیلے گرنے لگے۔ کچھ تھیلے چھتوں پر گر رہے تھے اور کچھ پانی میں جا کر ڈوب رہے تھے۔ تمام پنڈ میں افرا تفری پھیل گئی۔ جن کی چھتوں پر تھیلے نہیں آئے تھے۔ وہ پانی میں کود کر تیرنے لگے اور غوطے لگا کر تھیلے تلاش کرنے لگے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں تیرنا

نہیں آتا تھا۔ لیکن وہ اپنے بچوں کی بھوک پیاس سے مجبور ہو کر کود پڑے تھے۔ کوئی ڈوب رہا تھا۔ کوئی کسی کو بچا رہا تھا اور کوئی خوراک حاصل کرنے کے لئے بار بار غوطے لگا رہا تھا۔

ساجد پچھلی رات سے حمیدے کے مکان میں تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ جناب علی کے آدمی شادو اور اس کی ماں کو پکڑ کر حویلی میں لے گئے ہیں وہ بظاہر خاموش تھا۔ حمیدے کی طرح جوش میں آ کر وہ حویلی کی طرف جاتا تو خود بھی جناب علی کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتا۔

فوجی ٹریننگ میں بھی اس نے یہی سیکھا تھا کہ اگر ایک سپاہی گرفتار ہو جائے تو دوسرے کو جوش میں آ کر بغیر سوچے سمجھے دشمن کے علاقے میں نہیں جانا چاہیئے۔ پہلے دشمن کی طاقت اور منصوبوں کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ اور وہ سمجھ رہا تھا۔

جناب علی کے آدمی کس انداز میں لڑتے ہیں۔ اس کی تفصیل حمیدے نے اسے بتائی تھی۔ کیونکہ حمیدے کئی بار ان سے ٹکرا چکا تھا۔

جناب علی کے منصوبوں کا علم بھی کسی حد تک ہو چکا تھا۔ اس کی دشمنی کی محض دو وجوہات تھیں۔ ایک نورابو کے اغوا کے سلسلہ میں جو اس کی بدنامی ہوئی تھی، وہ اس کا بدلا ساجے سے لینا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ سیلاب کے سلسلہ میں اسے مجرم ثابت کرنا چاہتا تھا۔

ساجد سمجھ رہا تھا کہ شادو اور مائی خیراں کو صرف اس لئے حویلی میں بند کیا گیا ہے کہ وہ مجبور ہو کر انہیں چھڑانے کے لئے جائے گا۔ لیکن وہ جناب علی کو مایوس کر رہا تھا۔ اس نے دل کو سمجھا لیا تھا کہ شادو اور مائی خیراں یا تو جد وجہد کریں گی یا پھر اپنی جان دے دیں گی لیکن جناب علی کے سامنے نہیں جھکیں گی۔ پھر اسے ریشماں پر بھی اعتماد تھا کہ وہ اپنے خاوند کے عزیزوں کی حمایت ضرور کرے گی۔

حمیدے اسے بار بار سمجھا رہا تھا کہ حویلی پر حملہ کر دینا چاہیئے۔

اور ساجد سوچ رہا تھا کہ پنڈ والے ناصرہ کو دوبارہ چھڑانے آئیں گے۔ اس وقت وہ لوگوں کو اپنے اعتماد میں لے کر حویلی کی طرف جائے گا۔ جب تمام پنڈ کے لوگ اس کی حمایت کریں گے تو جناب علی کو اپنا رویہ بدلنا ہی پڑے گا۔

مگر صبح ہونے کے بعد بھی پنڈ سے کوئی ناصر کو لینے نہیں آیا۔ حمیدے نے پھر مجبور کیا کہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے اپنے باپ چودھری فضل دین کی بھی فکر تھی کہ نہ جانے جناب علی اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہوگا۔

ساجد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم اطمینان رکھو ۔ وہ لوگ چودھری کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں

ناب علی بہت چالاک ہے۔ وہ رابو کے اغوا کے الزام سے لئے چودھری کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گا۔"

یدے نے کہا۔

یرے ابا اب کبھی اس کا ساتھ نہیں دیں۔"

ساجد نے ناگواری سے کہا۔

م اچھی طرح جانتے ہو کہ جناب علی اور چودھری، دونوں ہی سیلاب کے مجرم ہیں۔ وہ اپنے جرم کو چھپانے کے لئے ایک دوسرے کا دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یدے سوچنے لگا کہ واقعی یہ حقیقت ہے۔ دو چور کبھی ایک دوسرے ت نہیں کرتے۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ہمیشہ ایک دوسرے نے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بھی حمیدے کا دل کہہ رہا تھا کہ اس کا باپ بے غیرت نہیں ہے۔ غوار کرنے کا انتقام ضرور لے گا۔ اور اگر باپ نے انتقام نہ لیا لے گا۔

نے اسے سوچتے دیکھ کر کہا۔

سرے پہلو پر غور کرو۔ کل جناب علی کے آدمی تمہیں اور ناصرہ کو ں آئے۔ لیکن اس کے بعد دوبارہ نہیں آئے۔ حالانکہ جناب علی

چاہتا تو سارے پنڈ کو یہاں لے آتا ۔ وہ خود تو رابو کے سلسلہ میں ہو گیا ہے ۔ تمہیں بھی ناصرہ کے سلسلے میں ضرور بدنام کر دیتا ـــ مگر وہ تمہارا خلاف قدم نہیں اٹھا رہا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چودھری تمہارے جیسے جوان بیٹے کو بچانے کے لئے جناب علی سے صلح کر لی ہے

حمیدے اس کی باتوں کا جواب نہ دے سکا ۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اسے حمیدے کی عقل تسلیم کر رہی تھی ۔ کم از کم یہ بات قابل غور تھی کہ ناصرہ کو حاصل کرنے کے لئے جناب علی کے آدمی دوبارہ کیوں نہیں آئے

اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا ۔

" میرا ملازم پنڈ گیا ہے ۔ وہ آئے گا تو بہت سی باتیں معلوم ہوں گی ...... ''

اسی وقت دور سے ہیلی کوپٹر کی آواز آنے لگی ۔

ساجد اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کے پاس آکر دیکھنے لگا پنڈ کی طرف ایک ہیلی کوپٹر چکر لگا رہا تھا ۔

اس نے تیزی سے پلٹ کر کہا ۔

" حمیدے ـــ سفید کپڑا یا دو سفید قمیضیں ہو تو نکالو میں سگنل دوں گا ۔ ''

یہ کہہ کر وہ دو عدد لکڑیاں تلاش کرنے لگا تاکہ ان

سفید کپڑا باندھ کر سگنل کے لئے فلیگ بنا سکے ۔ ناصرہ بھی دوسرے کمرے میں جا کر لکڑیاں تلاش کرنے لگی ۔

تھوڑی دیر میں دو ہاتھ بھر کی لکڑیاں مل گئیں ۔ ساجد نے ہر لکڑی کے سرے پر ایک ایک سفید کپڑا باندھ دیا ۔ اور جھنڈیاں تیار کر کے دوڑتا ہوا چھت پر آ گیا ۔

دور بہت دور ہیلی کوپٹر پرواز کر رہا تھا ۔ ساجد کو امید تھی کہ وہ ادھر بھی آئے گا ۔ وہ ہاتھوں کو بلند کر کے جھنڈیوں کو لہرانے لگا ۔ ہیلی کوپٹر نے پنڈ کے چار چکر لگائے ۔ وہ کچھ سامان بھی گرا رہا تھا ۔ اس کے بعد وہ دور ہوتا چلا گیا ۔

ساجد مایوسی سے دیکھنے لگا ۔ ہیلی کوپٹر دور بہت دور نقطہ کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا ۔ وہ جھنڈیوں کو پھینک کر چھت کی منڈیر پہ بیٹھ گیا ۔

حمیدے نے کہا ۔

" تم مایوس کیوں ہو گئے ؟ ہیلی کوپٹر اس طرف نہ بھی آئے تو کیا فرق پڑتا ہے ۔ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان بہت ہے ۔ ''

ساجد نے کہا ۔

" میں کھانے پینے کے لئے سگنل نہیں دے رہا تھا ۔ میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ عورتوں ، بچوں اور بیماروں کو یہاں سے نکال کر لے جائیں

کی کوشش کی جائے اور دوائیں زیادہ سے زیادہ بھیجی جائیں ۔۔۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہمارے صوبہ میں موٹر لانچ کی کمی ہے۔ بس ایک امید ہے کہ شاید موٹر لانچ کا انتظام ہو جائے ۔ ۔ ۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے چھت سے اتر کر کمرے میں آ گئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد حمیدے نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس کا ملازم پنڈ سے واپس آ رہا تھا۔ جب وہ کھڑکی کے قریب آیا تو حمیدے نے پوچھا۔

"ادے منوّر ۔ کیا خبر ہے ؟"

ناصرہ اور ساجد بھی کھڑکی کے پاس آ گئے تھے۔ ملازم نے ساجد کو دیکھ کر کہا۔

"صاحب جی! شادو اور مائی خیراں نے تو کمال کر دیا ہے۔ اس وقت ساری حویلی پر ان دونوں کا قبضہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ تینوں غیر یقینی نظروں سے ملازم کو دیکھنے لگے۔

حمیدے نے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جناب علی جیسے مکار آدمی کی حویلی پر دو عورتیں کس طرح قبضہ کر سکتی ہیں ؟ تو کہاں سے یہ باتیں سن کر آیا ہے۔"

ملازم نے جواب دیا۔

"ریشماں حویلی کی چھت پر کھڑی ہوئی پنڈ والوں سے کہہ رہی تھی کہ کوئی اس کا پیغام ساجے تک پہنچا دے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔"

ساجد نے خوش ہو کر فخریہ انداز میں کہا۔

"میں نے تم سے کیا کہا تھا حمیدے ۔۔۔ ! شادو اور ماں جی لڑیں گی یا مر جائیں گی لیکن جناب علی کے سامنے نہیں جھکیں گی۔"

ناصرہ نے تعجب سے پوچھا۔

"لیکن یہ ہوا کیسے ۔۔۔ ؟ جناب علی کے پاس تو اچھے لڑاکا آدمی ہیں کیا وہ عورتوں سے شکست کھا گئے ہیں۔"

ملازم نے کہا۔

ابھی ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ ریشماں کہہ رہی تھی کہ اس کا باپ تھوڑی دیر کے لئے مجبور ہو گیا ہے۔ شادو ایسی جگہ محاذ بنا کر بیٹھی ہوئی ہے کہ جناب علی کے آدمی اس کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اس لڑکی نے برکتے کو اس بری طرح زخمی کر دیا ہے کہ اب اس کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ ریشماں بار بار کہہ رہی تھی کہ کسی طرح ساجے کو تلاش کرو۔ اسے جلد آنے کے لئے کہو۔

"ہم ابھی چلتے ہیں۔" ساجد نے حمیدے سے کہا۔ "ناصرہ کو ابھی یہاں رہنے دو۔ پہلے ہم پچھلے راستے سے تمہاری کوٹھی میں جائیں گے۔ جب تک ہمیں حویلی میں داخل ہونے کا راستہ نہ ملے۔ اس وقت تک دشمنوں کی نظروں میں

آنا مناسب نہیں ہے ....۔"

وہ حمیدے کے ساتھ کمرے سے نکل کر زینے طے کرتے ہوئے نچلی منزل میں آگیا۔ حمیدے نے پانی میں اترتے ہوئے کہا۔

" میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے۔ فوراً ہی حویلی میں جانا چاہیئے۔"

" ہاں ۔۔ !" ساجد نے کہا۔" میں نے پہلے بھی انکار کیا تھا اور اب بھی حویلی میں جانے سے انکار کر رہا ہوں۔ تم جو شیلے انداز میں لڑنے کے عادی ہو۔ لیکن میں دشمنوں کی چال کو سمجھ کر آگے بڑھتا ہوں ۔۔ فرض کرو کہ جناب علی کے آدمی مکاری سے مجھے گھیر لیتے ہیں اور شادو سے کہتے ہیں کہ وہ اپنا محاذ توڑ دے ۔۔ پھر کیا نتیجہ ہو گا۔ شادو میری زندگی بچانے کے لئے محاذ توڑ دے گی۔ اس کی جدوجہد ناکام ہو گی اور میں بھی اس کے کام نہ آسکوں گا۔"

حمیدے نے کہا۔

" تم بہت سوچ کر قدم اٹھاتے ہو۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تمہارے ساتھیوں کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

ساجد نے مسکرا کر کہا۔

" مرنے والے اپنے گھر کی دہلیز پر بھی بزدلی سے مرجاتے ہیں۔ جو جدوجہد

کرنا جانتے ہیں وہ دشمنوں کے نرغے میں بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور تم سُن رہے ہو کہ شادو اور رماں جی اب تک زندہ ہیں۔"

حمیدے نے مکان سے باہر آکر اپنے ملازم سے رائفل اور کارتوس کی پیٹی لی اور ساجد سے پوچھا۔

" کیا تم خالی ہاتھ چلو گے ۔۔ ؟"

" ہاں ۔۔ !" وہ دور بہت دور بیٹھی ہوئی شادو کے خیال سے مسکرایا اور آہستگی سے بولا۔

" شادو بھی خالی ہاتھ حویلی میں گئی تھی۔ میں بھی جس طرح جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح رائفل میرے لئے بوجھ بن جائے گی۔"

تم کس طرح جاؤ گے ؟"

" میرے ذہن میں ایک منصوبے کو مکمل ہونے دو۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔"

حمیدے نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

" اچھی بات ہے ۔۔ پہلے میری کوٹھی میں چلو ۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم وہاں چھپ کر حویلی کے اندرونی حالات کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں آتی ہیں مگر ذرا دیر سے ....۔"

ساجد نے مسکرا کر کہا۔

وہ دونوں کمر تک پانی میں ڈوبے ہوئے جا رہے تھے اور ناصرہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی انہیں نظروں سے دور ہوتے دیکھ رہی تھی۔

اری جا احسان فراموش۔ ہمیں مصیبت میں پھنسا رکھا ہے اور کہتی ہے کہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ تمہاری جیسی عورتوں کے دلوں میں ہائے ہائے ہوتی ہے، مگر زبان سے واہ واہ کرتی رہتی ہو۔۔۔۔!

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

ریشماں نے اپنے ماما کو پانی پلا دیا۔ پانی پینے کے بعد اس نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے کہا۔

"میری بچی — میں مرجاؤں گا۔ ڈاکٹر کو بلا دے۔ میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

ریشماں کا دل موم ہوگیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا ماما اذیت ناک تکلیف سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ چہرے کا گوشت الٹ کر لال انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ یہ بھی سن چکی تھی کہ کانچ کے ٹکڑے اس کے زخموں میں نشتر کی طرح چبھ رہے ہیں — اُف! کیسی ناقابل بیان تکلیف ہو رہی ہوگی اس خیال سے ہی ریشماں کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوگئی۔

پھر وہ دل کو ذرا مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

"ماما — تم سے ہمدردی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ تم نے شیطانوں جیسا کام کیا ہے۔ کیا تمہیں ایسی سزا نہیں ملنی چاہیئے۔"

"میں شرمندہ ہوں بیٹی — شادو سے کہہ دے کہ وہ مجھے معاف کرسکتی ہے تو معاف کردے ورنہ مجھے گولی مار دے۔ مجھے اس طرح تڑپا تڑپا کر نہ مارے۔"

وہ بڑے دکھ سے برکتے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر شادو سے بولی

"شادو — میری ایک بات مانے گی؟"

"بول — کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ماما کو معاف کر دے۔"

مائی خیراں بگڑ کر بولی۔

"بکواس مت کر — اس کے آدمی نے دینو کو قتل کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

ریشماں نے کہا۔

"تو پھر اسے تڑپا تڑپا کر نہ مارو۔ بندوق مجھے دو۔ میں ایک ہی گولی سے اسے ختم کردوں گی۔"

"نہیں — اسے اسی طرح تڑپنے دو۔" مائی خیراں نے نفرت سے کہا۔

شادو بولی۔

"ماں جی — قانون اجازت نہیں دیتا کہ ہم کسی کو جان سے مار ڈالیں۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اسے زخمی کیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ساجے کے آنے تک اسے تڑپاتی رہوں گی۔ لیکن نہ جانے وہ کب آئیں گے۔ میرا خیال ہے اب اس کی مرہم پٹی ہو جانی چاہیئے۔"

"تو اپنے دشمن سے ہمدردی کرنا چاہتی ہے؟"

"ہمدردی نہیں ماں جی — ! میں خود کو مجرمہ اور قاتلہ بننے سے بچا رہی ہوں۔"

مائی خیراں تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے ریشماں سے کہا۔

"اچھی بات ہے — جا ڈاکٹر کو بلوا لے۔۔۔"

ریشماں خوش ہو کر اپنی ماں کی طرف جاتی ہوئی بولی۔

"امی — ڈاکٹر کو بلاؤ — ماں جی نے اجازت دے دی ہے۔"

ریشماں کی ماں نے دونوں ہاتھوں کو دعا کے انداز میں اٹھا کر کہا۔

"مائی خیراں — اللہ تجھے نیکی دے۔ میں تیرا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

وہ ملازم کو آوازیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

مائی خیراں نفرت سے بولی۔

"اری جا احسان فراموش — تمہیں مصیبت میں پھنسا رکھا ہے اور کہتی ہے کہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ تمہاری جیسی عورتوں کے دلوں میں ہائے ہائے ہوتی ہے مگر زبان سے واہ واہ کرتی رہتی ہو۔۔۔۔"

شادو نے اونگھتے ہوئے چونک کر پوچھا۔

"آں — کیا کہا ماں جی؟"

"اری تجھ سے نہیں کہہ رہی ہوں۔ تو تھوڑی دیر کے لئے سو جا — فکر نہ کر — کوئی سامنے آئے گا تو پہلے گولی ماروں گی پھر نام پوچھوں گی۔۔"

شادو بوریوں کے درمیان فرش پر بیٹھ کر بوریوں سے لگ گئی۔ اب نیند سے لڑنا اور جبراً جاگتے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہی نیند اس پر غالب آگئی اور وہ بیٹھے ہی بیٹھے سو گئی۔

مائی خیراں ہاتھ میں رائفل لئے بوریوں کے پیچھے کھڑی رہی۔ دور برآمدے کے آخری سرے پر جناب علی اپنے ایک آدمی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اسی وقت ریشماں کی ماں نے واپس آکر کہا۔

"تھانیدار اپنے سپاہیوں کے ساتھ آیا ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

جناب علی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"تھانیدار کو یہاں آنے دو۔ میں اسے دکھاؤں گا کہ یہ عورتیں میرے آدمی کو زخمی کر کے کس طرح قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہیں۔"

مائی خیراں کی بوڑھی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔
ریشماں کی ماں تھانیدار کو بلانے چلی گئی تھی۔ جناب علی نے کہا۔
"مائی خیراں — ! پولیس کے سامنے بڑے بڑے چور بدمعاش ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب اپنے بل سے باہر نکل آ — اسی میں تم دونوں کی بھلائی ہے۔"
"ہم اپنی بھلائی تجھ سے زیادہ سمجھتی ہیں۔"
"کیا تو ہتھیار نہیں پھینکے گی؟"
"نہیں — !"
"اس طرح کب تک کھڑی رہے گی؟"
"جب تک قانون کا محافظ نہیں آجاتا۔"
تھانیدار قانون کا محافظ ہے۔"
"میرا بیٹا بھی ہے۔"
"ضد نہ کر — ذرا عقل سے کام لے۔"
"جب مرنے کا ارادہ ہوگا تو تیری عقل سے کام لوں گی۔"
اتنے میں تھانیدار آگیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔
"کیا بات ہے — کہاں ہے مائی خیراں؟"
"وہ ہے —" جناب علی نے انگلی سے اشارہ کیا۔

تھانیدار نے مائی خیراں کی طرف دیکھا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟ رائفل پھینک کر ادھر آجا۔"
"اوے تھانیدارا — ایک قدم کے بعد دوسرا قدم نہ بڑھانا ورنہ گولی چلا دوں گی۔"
وہ غصّہ سے بولا۔
"تو مجھے دھمکی دے رہی ہے۔ میں اس علاقہ کا تھانیدار ہوں۔ سیدھی طرح خود کو میرے حوالے کر دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ انصاف کروں گا۔"
"انصاف کرنا ہے تو پہلے ساجے کو بلا کر لے آ — انصاف کرنا ہے تو پہلے جناب علی سے پوچھ کہ اس کے آدمیوں نے شادو کے باپ کو قتل کیوں کیا اور ہمیں یہاں لا کر کس لئے قید کیا ہے — ؟"
تھانیدار نے جناب علی کی طرف دیکھ کر آہستگی سے کہا۔
"میں سن چکا ہوں کہ دینو کو تمہارے آدمیوں نے مار ڈالا ہے۔"
جناب علی نے بھی آہستگی سے کہا۔
"ہم جرم کرتے ہیں اور تم ہمیشہ ہمارے جرم کو چھپانے کا معاوضہ لیتے آئے ہو۔ اس کا معاوضہ بھی طے ہو جائے گا۔ فی الحال برکتے کو اس کمرے سے نکالنا ہے۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔"

"ہم ــــ !" تھانیدار سوچنے لگا۔ پھر اس نے مائی خیراں سے کہا۔

"میں دینو کے قتل کی تفتیش کروں گا۔ جس نے بھی اسے قتل کیا ہے۔ میں اسے حراست میں لوں گا۔"

"ارے تفتیش کیا خاک کرے گا۔ قاتل تو تیرے سامنے کھڑا ہے۔"

تھانیدار نے جواب دیا۔

"جناب علی کے کسی آدمی نے قتل کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جناب علی قاتل سمجھا جائے گا۔ میں قانون کو تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔ تو میری بات مان لے اور برکتے کو میرے حوالے کر دے۔"

"نہیں ــــ ! نہ یہاں سے کوئی جائے گا اور نہ وہاں سے کوئی آئے گا میں پھر تجھ سے کہتی ہوں کہ انصاف کرنا چاہتا ہے تو پہلے ساجے کو ڈھونڈ کر لا ــ وہ تجھ سے بڑا افسر ہے۔ میں اس کے سامنے ہتھیار پھینک دوں گی۔"

تھانیدار اسے غرا کر دیکھنے لگا۔ جناب علی نے اس سے کہا۔

"برکتے بہت بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ اس بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ڈاکٹر کو وہاں تک جانے کی اجازت دی ہے۔ میرا ملازم ڈاکٹر سلام کو بلانے گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" تھانیدار نے کہا۔ "فی الحال اس کی مرہم پٹی ہو جائے۔ یہی بہت ہے۔ ہم اس بڑھیا سے بعد میں نمٹ لیں گے۔ ابھی یہاں سے چلو۔ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کر پہلے اپنے معاملات طے کر لیں۔"

جناب علی گہری نظروں سے تھانیدار کو دیکھنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تھانیدار اپنا معاوضہ طے کئے بغیر اس کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کمرے میں آیا۔ جہاں چودھری کو نظر بند کیا گیا تھا۔

وہ تینوں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

پہلے چودھری نے شکایت کی۔

"جناب علی ــ میں ہر طرح تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ مگر پھر بھی تم نے مجھے قید کر رکھا ہے۔"

جناب علی نے کہا۔

"تم قیدی نہیں ہو چودھری! میرے مہمان ہو۔ اس وقت ہمیں ایک دوسرے کی شکایت کرنے کی بجائے آپس میں دوست بن کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ ساجے ہمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جائے گا۔"

تھانیدار بڑی بے نیازی سے بولا۔

"میں تو قانون کا محافظ ہوں۔ جو کام کرتا ہوں قانون سے بچ کر کرتا ہوں

کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ سیلاب لانے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ تم لوگ ساجے پر الزام لگانا چاہتے ہو۔ لیکن میں اس کا ساتھ دوں تو یہ الزام مجھ پر آ جائے گا — لیکن میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں تم دونوں پر احسان کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہیں دینو کے قتل کے الزام سے بھی بچا سکتا ہوں۔ چودھری نے اگر ساتھ دیا تو تمہیں رابو کے قتل کے الزام سے بھی بچا سکتا ہوں۔ اور چودھری کو ساتھ دینا ہی ہوگا۔ ورنہ حمیدے بھی اغوا کے جرم میں گرفتار ہو جائے گا۔"

چودھری نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہاں میں ضرور ساتھ دوں گا۔ مجھے اپنے بیٹے کی زندگی عزیز ہے۔ ساجے نے رابو کو مہمان خانے میں قید کر رکھا ہے۔ میں اس سے ضرور انتقام لوں گا۔"

تھانیدار نے پوچھا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے رابو کو قید کیا ہے۔ میں پچھلی رات وہاں گیا تھا۔ رابو نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ساجے کے ساتھ ہے۔"

"آں —!" چودھری بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا۔ تھانیدار بولا۔

"چودھری — تمہاری بیٹی جب بھی بیان دے گی۔ جناب علی کے خلاف دے گی۔ اگر ایسا ہوا تو آپس میں دشمنی پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم رابو کو ملزمہ سمجھو۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" چودھری نے کہا۔ "میری بیٹی اپنی مرضی سے مہمان خانے میں نہیں گئی تھی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" تھانیدار نے سمجھایا۔ "لیکن تمہیں یہی کہنا ہوگا کہ وہ ساجے سے عشق کرتی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں اپنی بیٹی پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتا۔"

جناب علی نے کہا۔

"اگر تم نے اس پر الزام نہیں لگایا تو پھر سیلاب کا راز بھی راز نہیں رہے گا۔ میں اپنے ساتھ تمہیں بھی جیل میں لے جاؤں گا۔ تمہارے بیٹے سے بھی وہیں ملاقات ہو جائے گی۔"

چودھری پریشان ہو کر کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔

تھانیدار مسکرا کر بولا۔

"چودھری — اگر تم دونوں باپ بیٹے بوڑھی چودھرانی اور جوان رابو کو بے آسرا چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں ہے۔ اس بحث کو یہیں ختم کر دو۔"

جناب علی نے کہا۔

" برسوں کی عزت کو خاک میں ملا کر جیل جاؤ گے۔ یہاں تمہارے گھر پر کھیتوں میں اور تمہاری زمین کی ایک ایک آمدنی پر تمہارے رشتہ دار عیش کریں گے۔ اور یہ سب تمہاری ایک بیٹی کی خاطر ہوگا — میں کہتا ہوں اگر رالو ذرا سا بدنام ہو جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ یوں بھی تمام پنڈ والوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ دو راتوں سے غائب ہے اور ساجے اس کے ساتھ ہے۔"

" ہاں — !" چودھری نے سر جھکا کر کہا۔ " یہ سب ہی جان گئے ہیں لڑکی ذرا دیر کے لئے بھی گھر سے باہر چلی جائے تو اپنے ساتھ رسوائی لاتی ہے اور رالو تو دو راتوں سے غائب ہے۔"

" ہاں، اب تمہیں عقل آئی ہے۔ بھئی ایسی بدنامی سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہزار بدناموں کے باوجود رالو کے لئے رشتے آئیں گے۔"

" اچھی بات ہے۔ میں رالو کو سمجھاؤں گا کہ وہ جناب علی پر نہیں بلکہ ساجے پر الزام لگائے۔"

" اگر وہ تمہاری بات ماننے سے انکار کر دے تو — ؟"

" تو میں برسوں کی عزت کو خاک میں نہیں ملنے دوں گا۔ تم لوگ اطمینان

رکھو۔ میں رالو سے نمٹ لوں گا۔"

تھانیدار نے کہا۔

" جناب علی — یہ معاملہ طے ہو گیا۔ تم اغوا کے الزام سے بچ جاؤ گے اب دینو کو قتل ہوتے ہوئے جن لوگوں نے دیکھا ہے۔ انہیں ڈرا دھمکا کر یا کچھ پیسوں کا لالچ دے کر ہم ان کی زبان بند کر دیں گے — اب تم بتاؤ کہ ساجے کے جیل جانے کے بعد تمہاری بیٹی کہاں رہے گی۔"

" میرے گھر میں رہے گی اور کہاں رہے گی۔"

تھانیدار ہنستے ہوئے بولا۔

" نہیں جناب علی — وہ میرے گھر میں رہے گی۔"

جناب علی نے اسے غصہ سے دیکھ کر کہا۔

" فضول باتیں نہ کرو۔ اپنا معاوضہ بتاؤ ؟"

" یہی میرا معاوضہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اس خوبصورت بلا کا پرانا عاشق ہوں۔ کبھی تم نے وعدہ بھی کیا تھا کہ مجھے اپنا داماد بناؤ گے — اب وہ وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

چودھری نے ایک زوردار قہقہہ لگا۔ پھر طنزیہ انداز میں کہا۔

" اپنے جرم کو چھپانے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے میں اپنی عزت، دولت اور شہرت کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنی ہی بیٹی کو

کو بدنام کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اب تمہاری بھی بھلائی اسی میں ہے کہ ریشماں کا ہاتھ تھانیدار کے ہاتھ میں دیدو۔"

جناب علی پریشان ہو کر بولا۔

"یہ ـــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ریشماں ساجے کی بیوی ہے۔"

"ساجے کچھ دنوں میں جیل چلا جائے گا۔ ریشماں ایک مجرم خاوند سے طلاق لے سکتی ہے۔"

"لیکن میں اپنی بیٹی کو کیسے مجبور کروں کہ وہ ساجے سے طلاق لے؟"

تھانیدار مسکرا کر کہنے لگا۔

"تم مجبور نہ کرو۔ میں اسے راضی کر لوں گا۔ میں تو بڑے بڑے مجرموں کی کی رگ سیدھی کر دیتا ہوں۔ ایک عورت کو اپنے بس میں کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

چودھری بھی مسکرا کر بولا۔

"ہاں، عورت ایک کمزور جانور کا نام ہے۔ اسی لئے تو جناب علی میری بیٹی کو اٹھا کر مہمان خانے میں لے گیا تھا۔ اسی لئے تو وہ شاداو کو پکڑ کر یہاں لے آیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاداو بے زبان گائے کی بجائے پنجے مارنے والی شیرنی بن گئی ہے۔ مگر ہر عورت شیرنی نہیں بن سکتی۔ ریشماں بھی رابو اور ناصرہ کی طرح ایک کمزور لڑکی ہے۔"

"جناب علی ہم سب نے اب تک کسی کی بہن اور کسی کی بیٹی کا منہ کالا کیا ہے۔ چلو آج اپنی بیٹی کا بھی منہ کالا ہو جانے دو۔"

تھانیدار نے چودھری سے بگڑ کر کہا۔

"چودھری ـــ تم طعنے دے کر جناب علی کی غیرت کو جھنجھوڑنا چاہتے ہو؟"

چودھری نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"غیرت کو جھنجھوڑنے سے کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ اپنی بیٹی کی عزت بچانے کے لئے تمہاری شرط سے انکار کر دے گا ـــ؟ کیا یہ اپنے جرم کا اعتراف کر کے جیل چلا جائے گا ـــ نہیں، تھانیدار جی! جناب علی غیرت مند ہوتا تو اپنے داماد ساجے کے خلاف سازش نہ کرتا۔ سب سے پہلے اپنی بیٹی کے سہاگ کی حفاظت کرتا۔۔۔۔"

"بکواس مت کر ـــ!" جناب علی غصہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

تھانیدار نے بھی غرا کر کہا۔

"چودھری معلوم ہوتا ہے کہ تم دوستی نہیں دشمنی کر رہے ہو۔"

چودھری نے جواب دیا۔

"نہیں میں دشمنی نہیں کر سکتا۔ میں ایک مکھی کی طرح مکڑی کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ یہی حالت جناب علی کی بھی ہے۔ تم اسے گالیاں دے کر دس جوتے مارو۔ پھر بھی یہ تمہاری ہر ذلیل قسم کی شرط کے آگے جھک جائے گا۔"

جناب علی جھلّا کر بولا۔

"اور کیا تم تھانیدار کے آگے نہیں جھک رہے ہو؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں بھی جھک رہا ہوں؟"

تھانیدار نے کہا۔

"دیکھو چودھری۔ تم اپنی گفتگو کا انداز بدل دو۔ اس میں تم دونوں کی بھلائی ہے۔"

"فکر نہ کرو تھانیدار۔ ہم ایک دوسرے کو گالیاں دینے کے باوجود آپس میں دشمنی نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہم اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔"

تھانیدار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور جناب علی کے ساتھ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ تم لوگ آپس میں دشمنی نہیں کرو گے۔ پھر بھی یاد رکھنا کہ سامنے کو دشمنی کا موقع مل گیا تو وہ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ چودھری نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے بیٹی کا معصوم چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے بھی زیر لب مسکرا کر دل میں کہا۔

"میری بچی۔! میں جناب علی کی طرح بے غیرت نہیں ہوں۔۔۔"

جناب! سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ ہم سپاہی ہیں۔ ہم کسی شخص کو نہیں، بلکہ اسکے عہدہ کو سلام کرتے ہیں۔

حمیدے نے اپنی کوٹھی کی چھت پر آکر دیکھا تو حویلی کے باہر سپاہیوں کا پہرہ نظر آیا۔ اب وہاں جناب علی کے آدمی نہیں تھے۔ کرم دین اسے دیکھتے ہی چیخنے لگا۔

"اوے حمیدے! تجھ پر خدا کی مار ـــــ میری بیٹی کو واپس لے آ ـــــ ورنہ یاد رکھ یہاں تھانے دار آگیا ہے۔ اب تیری بدمعاشی نہیں چلے گی۔"

ایک سپاہی نے اس کی جانب رائفل تان کر کہا۔

"حمیدے ـــــ! جہاں ہے وہاں کھڑا رہ، اور سیدھی طرح بتا دے کہ لڑکی کہاں ہے؟"

آس پاس کی چھتوں پر لوگ کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔

ناصرہ کی ماں نے چھت کے سرے پر آکر کہا۔

"ارے اسے گولی مار دو۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اس نے میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی ہے۔"

دوسری چھت پر سے ایک نوجوان نے جو شیلے انداز میں کہا۔

"یہ پیسے والے غریبوں کی عزت کو عزت نہیں سمجھتے۔ حمیدے ناصرہ کو اٹھا کر لے گیا۔ جناب علی رابو کو لے گیا اور برکتے شادو کو پکڑ کر لے گیا ہے۔ ان لوگوں کو کتوں کی موت مارنا چاہیئے۔"

ایک اور چھت پر سے بوڑھی عورت بولی۔

"اے خدا بھی انصاف کرنے والا ہے۔ تم لوگوں نے سنا نہیں کہ یشماں کیا کہہ رہی تھی۔ برکتے تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے، شادو ایک کی ہو کر اکیلی اُن سے لڑ رہی ہے اور ان سپاہیوں کو دیکھو۔ شادو کی مدد کرنے کی بجائے حویلی کے باہر پہرہ دے رہے ہیں۔"

"اے بڑھیا ـــ!" ایک سپاہی نے کہا۔ "فضول باتیں نہ کر۔ ہمارا سردار جو حکم دیتا ہے ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔"

حمیدے نے سپاہی سے کہا۔

"سا جے بھی ایک فوجی افسر ہے۔ کیا تم اس کا حکم مانو گے؟"

"ضرور مانیں گے۔"

ساجد زینے کے پاس کھڑا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چھت کے سرے پر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی تمام سپاہی الرٹ ہو گئے۔

ساجد نے ایک سپاہی سے پوچھا۔

"تھانیدار کہاں ہے؟"

"وہ حویلی کے اندر ہیں۔"

"اسے حویلی میں گئے کتنی دیر ہو گئی ہے؟"

"تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔"

"ہمم ــــ!" ساجد نے کہا۔ "وہاں شادو، ماں جی اور چوہدری قید ہیں۔ تھانیدار کا فرض تھا کہ انہیں فوراً ہی باہر لے آتا۔ لیکن وہ حویلی میں جا کر شاید آرام کر رہا ہے ــــ جاؤ! تم اسے بلا کر لاؤ۔۔۔"

اسی وقت اوپری کمرے کی ایک کھڑکی کھلی اور تھانیدار نے سر نکال کر کہا۔

"ساجے ــــ! تم میرے سپاہیوں کو حکم نہ دو۔ وہ صرف میرے حکم پر چلیں گے۔"

ساجد نے جواب دیا۔

"تم بھول رہے ہو تھانیدار کہ تمام سیلاب زدہ علاقوں میں فوج دفاع کام کر رہی ہے۔ ایسے حالات میں صرف فوجی افسروں کا حکم چلتا ہے۔"

"تم فوجی افسر نہیں مجرم ہو۔ یہ سیلاب تمہاری وجہ سے آیا ہے۔"

"میں مجرم ہوں یا نہیں۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ تم اس بہانے سے شادو، ماں جی اور چوہدری کو قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ انہیں فوراً باہر لے آؤ۔"

"وہ میری حراست میں ہیں۔ تم بھی خود کو میرے حوالے کر دو ــــ"

تھانیدار نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "بشیرے ــــ دین محمد ــــ اللہ دتا ــــ جاؤ چوہدری کی کوٹھی کو گھیرے میں لے لو۔ ساجے نکل کر جانے نہ پائے۔"

تمام سپاہی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ آس پاس کی چھتوں پر کھڑے ہوئے لوگ چیخ رہے تھے۔

"یہ ظلم ہے ــــ تم ساجے کو گرفتار نہیں کر سکتے۔۔۔۔"

"یہ تھانیدار جھوٹ بولتا ہے۔ سیلاب آنا تھا۔ اس میں ساجے کا کیا قصور ہے؟"

خاموش رہو ــــ!" تھانیدار نے گرج کر کہا۔ "بیوقوفو! اگر تم لوگ ساجے کی بات نہ مان کر پولیٹیکل آفیسر کے منصوبہ پر کام کرتے تو سیلاب کبھی نہ آتا۔ وہ آفیسر بہت تجربہ کار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ

سیلاب کو روکنے کے لئے کس طرح بند باندھا جاتا ہے۔ لیکن تمہارے اس ساجے نے اپنی افسری کی شان دکھانے کے لئے بند کو کمزور کر دیا۔ آج اسی کی وجہ سے تم لوگ اس مصیبت میں گرفتار ہو۔"

ایک بڑھیا نے منہ بچا کر کہا۔

"ارے جا رہے جا — خدا کو جو منظور ہوتا ہے وہی سامنے آتا ہے ساجے کو ہم سے کیا دشمنی ہے کہ وہ بند کو کمزور بنا دیتا . . . ؟"

دوسری طرف سے ایک شخص نے کہا۔

"یہ سب ساجے کو پکڑنے کے بہانے ہیں۔ اوئے تھانیدار جی! اگر تم انصاف والے ہو، تو شادو، مائی خیراں اور چوہدری کو کیوں نہیں چھوڑتے؟ ان کا کیا قصور ہے؟ کیا وہ بھی سیلاب لانے کے مجرم ہیں . . . ؟"

"ہاں ہاں جواب دو؟"

چاروں طرف سے لوگ چلانے لگے۔

"انہیں حویلی سے باہر لاؤ۔"

تھانیدار نے نیچے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم لوگ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ ساجے کو حراست میں لے لو — !"

سپاہی اللہ دیتا نے کہا۔

"جناب — ! ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس کا حکم مانیں؟ آپ تھانے کے انچارج ہیں اور وہ فوجی کیپٹن . . . ."

"بیوقوف — !" تھانیدار نے گرج کر کہا۔ "ہمارا محکمہ الگ ہے اور اس کا محکمہ الگ ہے، تم لوگ میرے چارج میں ہو۔"

"جناب — ! محکمے الگ ہیں لیکن ملک ایک ہے۔ مقصد ایک ہے کہ ہر طرح قانون کی حفاظت کی جائے — اس وقت تمام سیلاب زدہ علاقے فوج کے زیر عمل ہیں۔ پولیس اور عوام فوج کی ہدایات پر سیلاب کی روک تھام کے لئے کام کر رہے ہیں۔"

سپاہی دین محمد نے کہا۔

"جناب — ! سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ ہم سپاہی ہیں — ہم کسی شخص کو نہیں، بلکہ عہدہ کو سلام کرتے ہیں اور ساجد صاحب آپ سے عہدہ میں بڑے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے . . . ."

ساجد نے خوش ہو کر کہا۔

"شاباش — تم لوگ واقعی ملک اور قوم کے وفادار ہو۔ میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کروں گا تھانیدار

تم باہر آؤ ۔ مجرم کون ہے، ابھی اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

تھانیدار نے کھڑکی بند کر دی۔

سب لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ نیچے اتر کر باہر آئے گا۔ تمام لوگوں کی نظریں حویلی کے بڑے دروازے پر لگی ہوئی تھیں وہ دروازہ بند تھا اور اب کسی دم کھلنے والا تھا۔

لیکن وہ دروازہ نہیں کھلا۔

جناب علی کے تین مسلح آدمی حویلی کے اندر تھے انہوں نے تھانیدار کے حکم پر دروازے میں اندر سے بڑا تالا لگا دیا۔ اس کے بعد تھانیدار نے دوبارہ کھڑکی کو کھول کر کہا۔

"ساجے ۔ جب تک سیلاب ختم نہیں ہو گا۔ حویلی کا دروازہ اندر سے بند رہے گا۔ نہ کوئی یہاں سے باہر جائے گا اور نہ ہی کوئی اندر آ سکے گا ۔ سیلاب ختم ہوتے ہی پولیٹکل آفیسر تمہاری گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے گا اس وقت ان بیوقوفوں کو معلوم ہو گا کہ یہ تمہارے جیسے مجرم کی حمایت کرتے رہے ہیں۔"

ساجد نے غصہ سے کہا۔

"تھانیدار ۔ حماقت نہ کر ۔ اگر میں مجرم ہوں تو تو کیوں مجرم کی طرح چھپ گیا ہے ؟ ۔ باہر آ ۔ ابھی تمام پنڈ والوں کے سامنے فیصلہ

ہو جائے گا۔ اگر میں مجرم ثابت ہوا تو مجھے گولی مار دینا . . . ."

تھانیدار نے کہا۔

"کم بخت ۔ تُو نے میرے سپاہیوں کو بہکا کر اپنی طرف کر لیا ہے میں بیوقوف نہیں ہوں کہ خود کو خطرے میں ڈالنے کے لئے باہر آ جاؤں۔ ذرا سیلاب کو ختم ہونے دے، تیرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑتے ہی میں باہر آ جاؤں گا۔"

ساجد نے دانت پیس کر کہا۔

"بزدل ۔ بے ایمان ۔ اس وقت میری ماں اور شادو خطرے میں ہیں، سیدھی طرح دروازہ کھول ۔ ورنہ میں دروازہ توڑ کر اندر آ جاؤں گا۔"

جناب علی نے چھت پر سے کہا۔

"ساجے ۔ میرے آدمی یہاں موجود ہیں، جونہی دروازہ توڑنے کی کوشش کرے گا، وہ گولی چلا دیں گے۔ تھانیدار قانون کا محافظ ہے۔ اسے تجھ سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا تھانے دار کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔"

ساجد نے کہا۔

"اگر تُو فرض کو اتنا سمجھتا ہے تو جنہیں قید کر رکھا ہے انہیں چھوڑ دے۔"

"میں نے تجھے سزا دینے کے لئے انہیں قید کیا ہے۔ میں نے اگر شادو کو رکھا ہے تو تو نے بھی چوہدری کی بیٹی کو مہمان خانے میں رکھ کر منہ کالا کر رکھا ہے"

حمیدے نے غصہ سے للکار کر کہا۔

"اوے کمینے ۔ تیرا خون پی جاؤں گا میں ۔ تو میری بہن کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔"

جناب علی نے جواب دیا۔

"جو سچ ہے وہ کہہ رہا ہوں۔ میں نے رالو کو اغوا نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی مرضی سے مہمان خانے گئی تھی۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ ساجے سے عشق کرتی ہے خود تیرا باپ اس بات کی گواہی دے سکتا ہے ۔ ٹھہر جا! میں ابھی چوہدری کو بلا کر یہاں لاتا ہوں۔ اپنے باپ کی زبان سے سچی بات سن کر شائد تجھے عقل آ جائے۔ . . ."

یہ کہہ کر وہ چوہدری کو بلانے چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر آس پاس کی چھتوں پر لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔ اور ساجد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

ساجد الجھن میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ چوہدری خود بھی سیلاب لانے کا مجرم ہے۔ لہٰذا وہ جناب علی کا ساتھ دے گا۔ پھر اسے رالو کا رویہ یاد آ گیا کہ وہ کس طرح دیوانگی کی حد تک اسے اپنا لینا چاہتی تھی۔ جناب علی نے،

ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ ساجے سے عشق کرتی ہے۔

حمیدے نے کہا۔

"ساجے ۔ مجھے یقین نہیں آتا مگر پھر بھی پوچھ رہا ہوں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

ساجد نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"میں تمہاری بہن کے دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ میری نیکی کا بدلہ کیا دے گی۔ ہاں، اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسے کبھی میلی نظروں سے نہیں دیکھا۔"

اتنے میں جناب علی، چوہدری کے ساتھ چھت پر آ گیا۔

تمام لوگ اپنی اپنی چھتوں پر کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔

چوہدری نے اپنے بیٹے حمیدے کو دیکھ کر کہا۔

"حمیدے ۔ ! تو نے ناصرہ کا اغوا کر کے مجھے اس بڑھاپے میں بدنام کر دیا ہے۔ تو یہ کیوں بھول گیا تھا کہ کوئی تیری بہن کو بھی اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔"

"میں نے جو کچھ بھی کیا تھا۔ اس پر شرمندہ ہوں۔ ناصرہ غریب سہی، لیکن وہ بھی کسی کی بیٹی اور بہن ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گا۔ اور اسے اپنی عزت بنا کر اپنے گھر میں رکھوں گا۔"

"حمیدے ۔ اچھی طرح سوچ لے، کہیں ایسا تو نہیں کہ تو پنڈ والوں سے

خوفزدہ ہو کر اسے اپنانا چاہتا ہے۔"

"نہیں ابا — میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں، میں سچے دل سے ناصرہ کی عزت کرتا ہوں، آپ بھی میرا حوصلہ بڑھایئے، تمام لوگوں کے سامنے کہہ دیجئے کہ آپ اسے بہو بنانا چاہتے ہیں۔"

جناب علی نے کہا۔

"یہ تم لوگوں نے کہاں کی باتیں چھیڑ دی ہیں، ناصرہ کا فیصلہ بعد میں بھی ہو سکتا ہے، تم پنڈ والوں کو ساجے کے متعلق بتاؤ کہ اس نے رالو کو کس طرح بہلا پھسلا کر مہمان خانے میں رکھا ہے۔"

"میں سب کچھ بتا دیتا ہوں، ذرا صبر سے کام لو۔ دانشمندی یہی ہے، کہ میں ناصرہ کو بہو بنا کر پنڈ والوں کو اپنے اعتماد میں لے لوں۔ پھر میں ساجے پر بھی الزام لگاؤں گا۔ وہ اس پر یقین کر لیں گے۔"

جناب علی نے قائل ہو کر کہا۔

"ہاں — تم ٹھیک کہتے ہو، ایک غریب لڑکی کی حمایت کرنے سے یہ لوگ تم پر اعتماد کرنے لگیں گے۔"

چوہدری نے کہا۔

"ذرا آگے آؤ — لوگ ہمیں اچھی طرح نہیں دیکھ رہے ہیں، دیکھو میں انہیں کس طرح بیوقوف بناتا ہوں۔"

وہ دونوں چھت کے سرے پر آ کر کھڑے ہو گئے، چوہدری نے چیخ کر کہا۔

"پنڈ والو — میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج سے ناصرہ میری بہو ہے، میرے بیٹے نے اپنی غلطی کو محسوس کیا ہے، مجھے اس پر ناز ہے اور خدا پر بھروسہ ہے کہ جس طرح میرے بیٹے نے ناصرہ کی عزت رکھی ہے خدا اسی طرح میری بیٹی کی بھی عزت رکھے گا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ میری بیٹی کو بدنام کرنے والا کون ہے — نہیں، میں صرف بتانا ہی نہیں چاہتا بلکہ اس مجرم کو تمہارے پاس لانا چاہتا ہوں، اور وہ ہے، جناب علی ...."

جناب علی چونکا، اس کے آدمیوں کے ہاتھوں میں رائفلیں سیدھی ہوئیں لیکن اس سے پہلے ہی چوہدری نے جناب علی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی، دو جسم آپس میں گتھے ہوئے پانی میں ایک چھپاکے سے گرے اور پانی اچھل کر دوسری منزل تک اڑتا چلا گیا۔

بس یہی آرزو تھی کہ تمہارے کام
آکر ہمیشہ تمہارے خیالوں میں زندہ رہوں
۔ اب میں مر کر بھی نہیں مروں گی اب تم
مجھے ہمیشہ یاد رکھو گے ۔ یاد رکھو گے نا؟

چوہدری نے دیکھتے ہی دیکھتے بازی پلٹ دی تھی۔

جناب علی نے اپنی حویلی کو ایک مضبوط قلعہ بنا رکھا تھا۔ اس قلعہ کے دروازے ابھی تک بند تھے۔ تاکہ نہ کوئی آسکے اور نہ کوئی باہر نکل سکے۔ لیکن چوہدری بڑی چالاکی سے اسے باہر نکال کر لے گیا تھا۔

اس اچانک اُفتاد سے جناب علی کے آدمی بھی بوکھلا گئے تھے وہ نیچے پانی میں دیکھ رہے تھے۔ جہاں اب چوہدری اور جناب علی سپاہیوں کے گھیرے میں آگئے تھے۔ سپاہی اللہ دِتا نے جناب علی کی گردن پکڑ کر پانی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا

"اپنے آدمیوں سے کہہ دے کہ فائرنگ نہ کریں۔ تمام ہتھیار پھینک

دیں۔ ورنہ تُو زندہ نہیں رہے گا۔"

اس دوران ساجد اور حمیدے بھی چھت سے اُتر کر نیچے آ گئے تھے۔ جناب علی نے ہانپتے ہوئے اپنی چھت کی طرف دیکھا اور گھبرا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

"ہتھیار پھینک دو — فوراً پھینک دو!"

تھانیدار نے چیخ کر کہا۔

"نہیں — ہتھیار نہ پھینکنا — جناب علی حماقت نہ کر — ابھی شاداں اور مائی خیراں یہاں قید ہیں — ساجے تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

ساجد نے ایک سپاہی سے پوچھا۔

"تمہارے پاس چاقو ہے؟"

"جی ہاں —!"

"لاؤ — مجھے دو — میں آہستہ آہستہ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ کاٹوں گا۔"

جناب علی خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ ساجد سپاہی سے چاقو لے کر کھولتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو کہ شاداں اور ریاں جی اپنی حفاظت کر رہی ہیں۔ مجھے ان کی فکر نہیں ہے۔ اور نہ ہی تمہاری موت کا مجھے افسوس ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔

جناب علی ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے بولا۔

"پھینک دو — ہتھیار پھینک دو — میں مرنا نہیں چاہتا — تم لوگ میرا نمک کھاتے ہو۔ میرا حکم مانو — ہتھیار پھینک دو —"

اس کے آدمیوں نے ایک ایک کر کے اپنی رائفلیں چھت کی بلندی پر سے پانی میں پھینک دیں۔

چاقو کی نوک اب تک اس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔ ساجد نے کہا۔

"اب ان سے کہو کہ حویلی کا دروازہ کھول دیں۔"

جناب علی نے کانپتے ہوئے کہا۔

"ساجے — تم میرے داماد ہو — کچھ تو رشتے کا خیال کرو۔"

"خیال کر رہا ہوں جس طرح تم آج تک رشتے داری نبھا رہے تھے۔ اسی طرح میں نبھا رہا ہوں۔ چلو، فضول باتیں نہ کرو۔ ان سے دروازہ کھولنے کے لئے کہو۔"

جناب علی نے چھت کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

"نیچے آ کر دروازہ کھول دو۔ یہ حویلی ساجے کی ہے میری جائیداد ساجے کی ہے۔ ارے جب میں نے بیٹی دیدی تو سمجھو ساجے کو

سب کچھ دیدیا ۔ دروازہ کھول دو . . . . "

اس کے آدمی چھت کے سرے سے پلٹ کر دوسری منزل کی طرف جانے لگے۔

تھانیدار کھڑکی بند کرکے دوڑتا ہوا دوسری منزل کے زینے کی طرف آیا۔ پھر زینے پر جیسے ہی اس کے آدمی نظر آئے، اس نے ریوالور سے فائر کردیا۔ وہ بوکھلا کر پھر اوپر چلے گئے۔

"خبردار ۔ کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کرے ۔ چلو اوپر جاؤ اور اپنے مالک کو سمجھاؤ کہ مجھ سے غداری نہ کرے۔ اب بھی ہم سب مل کر ساجے کو مجرم ثابت کرسکتے ہیں ۔ اگر جناب علی اس کی باتوں میں آگیا تو اسے ساری زندگی جیل میں گزارنی ہوگی . . . "

اس کے آدمی واپس چھت پر چلے گئے۔

تھانیدار تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا ریشماں کے کمرے کے پاس آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ریشماں اور اس کی ماں اندر بیٹھی ہوئی ایک دوسرے سے جھگڑا کررہی تھیں۔ ماں بیٹی کو قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ اور بیٹی اپنے باپ کے ظلموں کا حساب کر رہی تھی۔

"دروازہ کھولو ۔!" تھانیدار نے دستک دے کر کہا۔

"جاؤ یہاں سے ۔!" ریشماں حقارت سے بولی ۔ "دروازہ نہیں کھلے گا۔"

تھانیدار سختی سے بولا۔

"ساجے کے آدمیوں نے جناب علی کو پکڑ لیا ہے۔ اگر تم لوگوں نے اس کی طرف سے صفائی پیش نہ کی تو ساجے اسے جان سے مار ڈالے گا۔"

"نہیں ۔!" ریشماں کی ماں گھبرا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ ریشماں نے اسے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔

"دروازہ مت کھولو۔ میں اس تھانیدار کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"وہ کیا تجھے کھا جائے گا۔ کم بخت تیرا باپ خطرے میں ہے اور تجھے اس کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ چل ہٹ جا میرے راستے سے ۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دھکا دیا۔ ریشماں پیچھے کی جانب لڑکھڑاتی ہوئی کرسی سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتی، اس کی ماں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

تھانیدار نے اس کے بازو کو سختی سے پکڑ کر کہا۔

"تم جاؤ اور اپنے خاوند سے کہو کہ اس کی بیٹی اور ساجے کی بیوی میرے قبضے میں ہے۔ اگر انہوں نے مجھے نقصان پہنچانا چاہا۔ تو انہیں ریشماں کی لاش ہی ملے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ریشماں کی ماں کو ایک جھٹکے سے کمرے کے باہر پھینک دیا اور دروازے کو اندر سے بند کر کے قہقہہ لگانے لگا۔

ریشماں سہم کر کھڑی ہو گئی۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"پہلے چوہدری نے غداری کی اور اب تمہارا باپ میرا ساتھ چھوڑ رہا ہے میں مات پر مات کھا رہا ہوں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ساجے مجھے جان سے مار کر قانون کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ مجھے جیل بھجوا سکتا ہے۔ اب مجھے ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ پھر کیوں نہ آخری بار تمہاری جوانی سے اپنی پیاس بجھا لوں . . . ."

وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔

اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سیدھی طرح میری آغوش میں آجاؤ۔ میں جیل کی چار دیواری میں جا کر ہمیشہ تمہارے جسم کی مٹھاس کو یاد رکھوں گا۔"

اس نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

"چھوڑ کمینے — بدمعاش . . . ."

وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں تجھ جیسے بدمعاشوں پر تھوکتی ہوں — تھو!"

اس کے منہ پر تھوک آ کر پڑا اور وہ کلائی چھڑا کر دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی تھانیدار نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگی۔

اس نے ایک جھٹکے سے اسے پلنگ کی طرف دھکیل دیا۔ وہ چکراتی ہوئی پلنگ کے سرہانے پر آ گری۔ یک بیک اسے یاد آیا کہ ساجے کے سوٹ کیس سے نکالا ہوا چاقو تکیہ کے نیچے رکھا ہوا ہے۔

اس کا ہاتھ تکیہ کے نیچے گیا۔ چاقو اس کی مٹھی میں آیا۔ اسی وقت تھانیدار نے پیچھے سے اس کے کرتے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا — وہ ہاتھ نہیں آئی۔ لیکن اس کا کرتا پھٹتا چلا گیا۔ اور اجلی شفاف پیٹھ ننگی ہوتی چلی گئی۔

وہ چاقو کو کھول کر تیزی سے اس کی طرف پلٹ گئی۔

"خبردار — ایک قدم بھی آگے بڑھے تو مجھے زندہ نہیں پاؤ گے۔"

وہ اپنے سینے پر چاقو کی نوک رکھے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"میں — میں اپنی جان دیدوں گی مگر ساجے کی امانت میں خیانت نہیں کرونگی۔"

تھانیدار بڑی تشویش سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن وہ اسے دھمکی نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ تو خود ہی مرنے کیلئے تیار تھی اور وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ جیل جانے سے پہلے وہ ریشماں کو حاصل کرنے

کی بہت پرانی آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب وہ بھی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔
وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"اچھی بات ہے۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ تم فوراً باہر چلی جاؤ۔"

اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو پوری طرح کھول دیا

وہ آہستہ آہستہ اس سے کتراتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔ چاقو کا دستہ مضبوطی سے اس کی مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ دیوار سے لگی ہوئی چوکھٹ پر آئی۔ تھانیدار نے اچانک پوری قوت سے دروازے کے پٹ کو بند کیا۔ ریشماں کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ وہ ذرا دیر کے لئے دروازے اور چوکھٹ کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔ پھر تھانیدار نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"جانِ من — میرے ہاتھ سے تو بڑے بڑے مجرم بچ کر نہیں نکلتے۔ تمہاری جیسی نازک تتلی کیسے بچ کر نکل سکتی ہے۔"

وہ آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی لگانا چاہتا تھا۔ لیکن ریشماں اس کی گرفت سے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے اتنا موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ کہ دروازے کو اندر سے بند کر سکتا۔

اسی وقت دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ تھانیدار ریشماں کو لئے ہوئے فرش پر گر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا۔ ساجد نے ریوالور والے ہاتھ پر ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ ریوالور دور پلنگ کے نیچے جا کر چھپ گیا۔ تھانیدار

نے فرش پر سے اچھل کر اس پر حملہ کیا۔ ساجد ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنے ہی جھونک میں ڈگمگاتا ہوا چوکھٹ پر جا کر گر پڑا۔ ٹھیک اسی جگہ ریشماں کے ہاتھ سے گرا ہوا چاقو — پڑا ہوا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دور زینے کی طرف سے حمیدے کئی لوگوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے چاقو کو تھام کر فرش پر سے اٹھ گیا۔

دوسری طرف ساجد، ریشماں کو فرش پر سے اٹھا رہا تھا۔ تھانیدار کو ننگے چاقو کے ساتھ ساجد کی طرف آتے دیکھ کر ریشماں نے چیخ ماری اور اس سے لپٹ گئی۔ تیزی سے آتا ہوا چاقو اس کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ اسکے حلق سے دوسری چیخ نکلی اور وہ ساجد کی بانہوں میں تڑپنے لگی۔

تھانیدار نے اس کی پشت سے چاقو نکال کر دوسرا حملہ کرنا چاہا۔ اس سے پہلے ہی ساجد کا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور وہ الٹ کر پھر چوکھٹ کی طرف چلا گیا۔ حمیدے اور سپاہیوں نے پیچھے سے آ کر اسے جکڑ لیا۔

ساجد نے ریشماں کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ اکھڑی اکھڑی سی سانسیں لے رہی تھی۔ ساجد نے کہا۔

"حمیدے — جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

حمیدے دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ریشماں —" ساجد نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا۔ تم میرے

سامنے کیوں آگئیں۔"

"اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے۔!" وہ کہنے لگی۔ "بس یہی آرزو تھی کہ تمہارے کام آکر ہمیشہ تمہارے خیالوں میں زندہ رہوں۔ اب میں مر کر بھی نہیں مروں گی۔ اب تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گے۔ یاد رکھو گے نا؟"

"ہاں ریشماں۔ مگر۔ مگر تم ایسا کیوں سوچتی رہیں۔ کیا میں تم سے محبت نہیں کرتا تھا؟"

"تم محبت کرتے تھے۔ لیکن میرا ضمیر کہتا تھا کہ میں تمہیں سہاگ کے رشتے میں باندھ کر تمہیں محبت کرنے کیلئے مجبور کر رہی ہوں۔ ساجے! میرے ساجے! ایک خوبصورت کنول کے پھول کو حاصل کرنے کیلئے دلدل میں جانا پڑتا ہے میں بھی تمہیں حاصل کرنے کیلئے برائی کی دلدل میں چلی گئی تھی مجھے معاف کر دو۔۔۔"

"میں نے شادی کی پہلی رات ہی کو تمہیں معاف کر دیا تھا۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔ جو غلطی بھلا دی گئی تھی۔ اس کیلئے تم نے اتنی بڑی سزا قبول کر لی۔ تم اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر مجھ سے دور ہو جانا چاہتی ہو۔ یہ کیسا ظلم کر رہی ہو ریشماں؟"

ریشماں کے ہونٹوں پر ایک مرجھائی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ہولے سے بولی

"لوگوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ جلدی کرو۔ میں۔ میں۔ میری سانس رک رہی ہے۔۔۔"

ساجد نے سر گھما کر کہا۔

"تم لوگ ذرا دیر کے لئے باہر چلے جاؤ۔!"

تمام لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے ساجد نے پوچھا۔

"بولو ریشماں! کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ بڑی حسرت سے اسکی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

"میں۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے پیار کر دو!"

ساجد کا دل رونے لگا۔ اس نے بڑی محبت سے اس حسین مورت کو دیکھا پھر آگے کو جھک کر اس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے یہ ریشماں کی جیت کا پہلا اور آخری بوسہ تھا۔

پہلے ان ہونٹوں کی لرزش ختم ہوئی۔ پھر ان ہونٹوں کی گرمی ماند پڑی۔ اس کے بعد اس کا سر ساجد کے سینے پر ڈھلک گیا۔

کسی بھی افواہ کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟ یہ آج تک کوئی نہ جان سکا۔ بعض اوقات جھوٹی باتیں بھی سچی معلوم ہوتی ہیں اور لوگ اس پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں۔

ایک دن اور ایک رات، اور گزر گئی۔

ساجد، ریشماں کے کمرے ہی میں بیٹھا رہا۔ ریشماں اب وہاں نہیں تھی وہ خود ہی اسے سیلاب زدہ علاقہ سے دور منوں مٹی کے نیچے دفن کر آیا تھا۔ لیکن وہ اب تک اس کے خیالوں میں جاگ رہی تھی اور رہ رہ کر اسے تڑپا رہی تھی۔ وہ جاتے جاتے اپنی محبت اور وفاداری کا ایسا نقش چھوڑ گئی تھی۔ جو ساجد کے ذہن سے کبھی مٹ نہیں سکتا تھا۔

حمیدے اور مائی خیراں نے کئی بار اس کے پاس آکر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے تسلیاں بھی دیتی رہیں۔ ثنا دور دور سے اسے دیکھتی رہی اس کے بس میں ہوتا تو وہ بھی اسے جا کر سمجھاتی۔ مگر سمجھانے کا کوئی رشتہ

نہیں تھا، محبت کے رشتے کو دل مانتا ہے۔ دنیا نہیں مانتی۔ اس لئے فی الحال وہ کسی بھی حیثیت سے دوسروں کی موجودگی میں اس کے قریب نہیں جا سکتی تھی

رابو اپنی کوٹھی میں واپس آگئی تھی۔ ریشماں کے مرتے ہی اس کے دماغ میں پھر محبت کے کیڑے کلبلانے لگے تھے میدان صاف تھا۔ ساجد پر ابھی کسی کا حق نہیں تھا، وہ اپنی حق کسی نہ کسی طرح جتا سکتی تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے باپ اور بھائی کے سامنے ساجد کی نیکی اور شرافت کا اعتراف کر چکی تھی۔ کوئی غلط رویہ اختیار کر کے اسے حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ بھی ہو اس کے دماغ کے اندر ساجد ایک لاوے کی طرح پک رہا تھا

ناصرہ بھی اپنے ماں باپ کے پاس واپس آگئی تھی۔ چوہدرانی نے بیٹے کی خوشی پوری کرنے کے لئے اسے اپنے ہاتھ کی ایک انگوٹھی پہنا دی تھی اور تینوں وقت اپنے ہاں سے پکی ہوئی روٹیاں بھیجا کرتی تھی۔ تاکہ اس کی ہونے والی بہو بھوکی نہ رہے۔

برکتے کی مرہم پٹی برابر ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اعتراف کیا تھا کہ رابو کو جناب علی کے لئے اغوا کرنے میں اس کا ہاتھ ہے۔

رفتہ رفتہ ریشماں کا غم کچھ ہلکا ہوا تو مائی خیراں نے بیٹے کو سمجھایا۔

"ساجے ۔۔۔ کیا تو اپنا فرض بھول گیا ہے چل اٹھ! مجرموں سے انکے جرم کا حساب لے!"

وہ سر جھکا کر پہلی بار ریشماں کے کمرے سے باہر آیا۔ مائی خیراں نے ایک سپاہی سے کہا۔

"ساجے کا سامان اس کمرے سے اٹھا کر میرے ہاں پہنچا دو۔ یہاں وہ دوبارہ آئے گا۔ تو پھر اداس ہو جائے گا۔ ۔ ۔ ۔"

اس کا تمام سامان اٹھ کر جانے لگا۔ ریشماں کی ماں بال بکھرائے اپنے کمرے کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور ویران آنکھوں سے اپنی اجڑی ہوئی حویلی کو دیکھ رہی تھی۔ بیٹی گئی۔ داماد گیا اور اب خاوند بھی کسی دن جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے والا تھا۔

ساجد، چوہدری کی کوٹھی میں آیا تو پنڈ کے بڑے بوڑھوں کی مجلس ہو رہی تھی

ساجد نے ان سے کہا۔

"اس پنڈ میں سیلاب سے جو تباہی آئی ہے اس کے ذمہ دار چوہدری اور جناب علی ہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے کاغذ اور قلم لا کر رکھے جائیں۔ تاکہ یہ تمام لوگوں کی موجودگی میں تحریری بیان دے سکیں۔"

حمیدے کاغذ اور قلم لانے کیلئے چلا گیا۔ ساجد نے کہا۔

"مجھے چوہدری سے ہمدردی ہے، کیونکہ اس نے بغیر کسی حیل وحجت کے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ لیکن جناب علی کا اب بھی کوئی داؤ لگے تو وہ اپنے جرم سے صاف مکر جائیگا۔ ویسے فی الحال انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پنڈ کے تمام

لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس کی حویلی میں کیسے کیسے تماشے ہوتے رہے ہیں۔

اس نے اگر سیلاب لانے کے جرم سے انکار کیا تو را بو کے اغوا کے جرم سے نہیں بچ سکے گا۔ دوسرا بڑا جرم یہ ہے کہ اس کے آدمیوں نے دینو چاچا کو ہلاک کیا ہے تیسرا جرم یہ ہے کہ اس نے چوہدری، شادو اور سائی خیراں کو قیدی بنا کر اپنی حویلی میں رکھا تھا۔ تھانیدار جیسے ظالم آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی۔ اگر یہ تھانیدار سے سازباز نہ کرتا تو ۔۔۔ تو آج ریشماں مجھ سے جدا نہ ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ "

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

تمام لوگوں نے اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم لوگوں نے کتنی بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے سہاگ اجاڑ دیئے ہیں کسی کا خاوند چھین لیا اور کسی کی بیوی کو ہلاک کر دیا، تمہاری وجہ سے کتنے ہی بچے ڈوب گئے جو زندہ ہیں، وہ بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ لوگ سیلاب کا گندہ پانی پی کر بیمار ہو رہے ہیں ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں کتنے ہی مٹی کے مکانات پورے خاندان کے ساتھ سیلاب کی تہہ میں بیٹھ گئے ہیں۔

یہ صرف آج کی تباہی نہیں ہے۔ یہ آنے والے کل کی بھی تباہی ہے اب اس پنڈ میں برسوں کسی کی بارات نہیں آئے گی۔ کسی کنواری کی ڈولی نہیں اٹھے گی۔ کیونکہ مدتوں سے تنکا تنکا کر کے جو جہیز جوڑا گیا تھا۔ وہ سب سیلاب کی ظالم لہریں بہا کر لے گئی ہیں۔

جناب علی۔ کچھ روز پہلے تمہاری حویلی سے شہنائی کی آواز گونج رہی تھی اب یہ شہنائی یہاں کی لڑکیوں کے صرف سپنوں ہی میں رویا کرے گی۔ تم لوگوں نے صرف جان و مال کو نقصان نہیں پہنچایا، انسان کے جذبوں کا بھی خون کیا ہے۔

تم لوگوں کو اتنے بڑے جرم کی سزا کیا ملے گی؟ یہ میں نہیں جانتا۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کرنے والے ہی بہتر جانتے ہیں۔ لیکن میں فی الحال تھوڑا سا جرمانہ تم لوگوں پر کروں گا۔ اور یہ محض اسلئے کہ میں یہاں کے لوگوں کو بھوک پیاس سے مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ ہیلی کاپٹر سے جو خوراک پھینکی جاتی ہے وہ آدھی سے زیادہ ضائع ہو جاتی ہے۔ کسی کو ملتی ہے اور کسی کو نہیں ملتی۔

لہٰذا آج سے تم دونوں کے اناج کے ذخیروں میں سے پنڈ والوں کو کھانا تقسیم کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بھوک پیاس تم ہی لوگوں کی لائی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔

"یہ بہت اچھا فیصلہ ہے یہ ان کیلئے سزا ہے اور پنڈ والوں کیلئے نیکی ۔ ۔ ۔"

دوسرے نے کہا۔

"ساجے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے کل سے بھوکے ہیں آج جہاز سے گرنے والا کھانا ہماری چھت پر نہیں آیا۔ کھانا بھی اب ایسے آتا ہے جیسے بھولے بھٹکے کوئی لاٹری نکل آتی ہے۔"

"گھبراؤ نہیں۔" ساجد نے کہا۔ "آج ہی سے اس کوٹھی اور حویلی کی چھت پر لنگر کھلے گا۔"

تمام لوگ اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ چوہدری اور جناب علی سر جھکائے کورے کاغذ پر اپنا اپنا اعمال نامہ لکھ رہے تھے۔

چوہدرانی زینے کے پاس کھڑی ہوئی اپنے خاوند کو جرم کا اعتراف کرتے دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں ساجد کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ آج تک اس پنڈ میں کسی نے چوہدری کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ساجے کی وجہ سے آج وہ مجرم ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اس پر ستم یہ کہ ان کے اناج کا ذخیرہ پنڈ والوں میں تقسیم ہونے والا تھا۔ چوہدرانی کی نظر میں ساجد نے صرف ایک ہی بھلائی کی تھی کہ اس کی بیٹی کی عزت بچائی تھی۔ مگر اس نیکی کا وہ بہت بڑا معاوضہ ان سے لے رہا تھا۔

وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہی اور یہ بھی اچھی طرح سمجھتی رہی کہ وہ ساجد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے۔ وہ جھنجلاتی ہوئی دوسری منزل میں آئی اور رابو کو دیکھ کر بولی۔

"میرا بس چلے تو میں ساجے کو زندہ دفن کر دوں۔"

"کیوں امی۔ کیا ہو گیا۔ ساجے نے کچھ کہا ہے؟" رابو نے حیرت سے پوچھا۔

"کہے گا کیا۔ تجھے نظر نہیں آتا۔ وہ تیرے باپ کو جیل بھیجے گا۔ ہمارے ہاں سال بھر کا اناج رکھا ہوا ہے اسے پنڈ والوں میں تقسیم کرے گا۔ یہ تو سراسر ظلم ہے کیا اسے سزا دینے والا کوئی نہیں ہے۔"

رابو نے کہا۔

"دوسرے کو سزا دینے کی بجائے اپنے بچاؤ کی تدبیر کرنا چاہیئے۔ ابا تو پہلے بھی کئی بار رشوتیں دیکر یا بچاؤ کر چکے ہیں۔ کیا اس بار رشوت سے کام نہیں چلے گا۔ ساجے بھی آدمی ہے۔ اس کے اندر بھی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہو گی۔"

چوہدرانی نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں۔ ساجے کو ایک بار پیار محبت سے سمجھا کر آزمانا چاہیئے۔"

رابو بڑے ہی معنی خیز انداز میں بولی۔

"پیار کی رشوت ایسی دیجیے جو بہت خوبصورت ہو۔ بہت قیمتی ہو۔ تاکہ وہ انکار نہ کر سکے۔"

چوہدرانی چونک کر اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی۔ وہ اتنی خوبصورت اور اتنی قیمتی تھی کہ کوئی بھی مرد اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

رابو ماں کی نگاہوں سے شرما کر چلی گئی۔

"بیٹی کو ایک نہ ایک دن اس گھر سے جانا ہی ہے اگر رشوت کے طور پر عزت سے ڈولی میں بیٹھ کر ساجد کے ساتھ چلی گئی تو چوہدری جیل میں جانے سے بچ سکتا ہے۔"

چوہدرانی ایک نئے انداز سے سوچنے لگی۔ بیٹی کی شرمیلی ادائیں بہت کچھ کہہ گئی تھیں کم از کم اتنا تو پتہ چل ہی گیا۔ کہ وہ ساجد کو پسند کرتی ہے۔

اسی شام کو لنگر کھل گیا۔

چوہدری کی چھت پر بڑی بڑی دیگیں چڑھا کر دال پکائی گئی تھی اور جناب علی

کی چوبلی میں مٹی کے تیل کے چولہوں پر روٹیاں اتاری جا رہی تھیں۔ ہر گھر میں دس روٹیاں، دو پیالے دال اور بچوں اور بیماروں کیلئے ایک گلاس پانی دیا جا رہا تھا۔ ٹرک کے ہوا بھرے ہوئے ٹیوب پر کھانے کی چیزیں تمام گھروں تک پہنچ رہی تھیں۔

شاد و اور ناصرہ روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ساجد اور حمیدے ان روٹیوں کو دو دو گھروں تک پہنچا رہے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان دونوں کو احساس ہوا کہ رالو کے متعلق کچھ نئی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ ساجد جہاں بھی روٹیاں پہنچانے گیا وہاں کچھ اس قسم کے سوالات ہوتے گئے۔

کیا رالو تمہارے ساتھ مہمان خانے میں اکیلی تھی؟"

"جی نہیں۔!" ساجد نے اس سوال کی تسلی کی۔ "مہمان خانے میں جمّاں پہلوان اور اسکی بیوی بچے بھی تھے۔"

دوسری جگہ دوسری بات کہی گئی اور بڑی ہی ہمدردی کے ساتھ کہی گئی۔

"بھئی ساجے۔ یہ دنیا والے بدنام کرنے سے باز نہیں آتے کہتے ہیں ناصرہ، حمیدے کے پاس رہ کر آئی ہے اور رالو، ساجے کے پاس۔۔۔"

حمیدے کا خون کھول گیا۔ اس نے غصہ سے کہا۔

"بکواس مت کرو تم سے کس نے ایسی بات کہی ہے۔"

اس نے دوسری چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ بشریٰ کی متریٰ ماں کہہ رہی تھی۔"

بشریٰ کی متریٰ ماں سے پوچھا گیا تو وہ بولی۔

"وہ سامنے والی چھت پر باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے جو سنا، وہ کہہ دیا۔"

سامنے والی چھت کے لوگوں سے پوچھا گیا تو جواب ملا۔

"پتہ نہیں۔ کوئی گلی میں سے باتیں کرتا ہوا گزر رہا تھا میں نے جو سنا کہہ دیا۔"

ساجد اور حمیدے غصہ اور پریشانی سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ ایک بوڑھی نے کہا

"ساجے۔ کسی بھی افواہ کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے۔ یہ آج تک کوئی نہ جان سکا۔ بعض اوقات جھوٹی باتیں بھی سچی معلوم ہوتی ہیں اور لوگ ان پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں اب یہی دیکھو کہ تم نے رالو سے نیکی کی ہے لیکن حالات کہتے ہیں کہ جس طرح ناصرہ حمیدے کے ساتھ رہ کر آئی ہے۔ اسی طرح رالو بھی تمہارے ساتھ رہ چکی ہے۔ دیکھو ناراض ہونے کی بات نہیں ہے۔ حمیدے ہم تمہاری بہن کو برا نہیں کہتے۔ لیکن ٹھنڈے دل سے سوچو تو پنڈ کے تمام لوگ رالو کو ناصرہ کے خانہ میں رکھ کر سوچنے پر مجبور ہیں وہ زبان سے کچھ نہیں کہیں گے پھر بھی تم ان کے سوچنے کے انداز کو نہیں بدل سکو گے۔۔۔۔"

حمیدے کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں وہ تیزی سے پلٹ کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا ساجد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے نیکیوں کے بدلے بدنامیاں اور رسوائیاں کیوں مل رہی ہیں۔ ایک بڑھیا نے چیخ کر کہا۔

"ارے کیسا زمانہ آگیا ہے تم لوگ نیکی کر نیوالے کے راستے میں کانٹے بچھا رہے ہو۔ تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

"ہم نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ بھئی سنی ہوئی بات کہہ دی ہے تو کون سی برائی

کردی، ہم ساجے کے دشمن تو نہیں ہیں۔"

"ارے ہم تو ساجے اور رابو کی بھلائی کیلئے کہہ رہے ہیں۔ آج نہیں تو کل ساجے دوسری شادی ضرور کریگا پھر کیوں نہ وہ رابو سے شادی کرلے۔ لوگوں کی زبانیں خود بخود بند ہوجائیں گی۔۔۔۔"

ساجد کو یوں لگ رہا تھا جیسے پستی کے اندھیروں میں گرایا جارہا ہے لوگ بظاہر اس سے ہمدردی کررہے ہیں۔ اپنی دانست میں نیک مشورے دے رہے تھے۔ لیکن ان ہمدردیوں اور مشوروں کے پس پردہ یہی رسائی تھی کہ وہ رابو کی عزت کا لٹیرا ہے۔

شادو نے سنا تو پھر اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ریشماں کی موت کے بعد ایک ذرا آس بندھی تھی کہ ساجے اب اسی کا ہے لیکن یہ آس بھی ٹوٹ رہی تھی۔ اب اسے یقین ہوتا جارہا تھا۔ کہ وہ محبت کے معاملے میں بدنصیب ہے جہاں ایسی امیر زادیاں ہوں، وہاں ایک غریب لڑکی کی محبت راس نہیں آتی۔

مائی خیراں کو معلوم ہوا تو وہ طنطناتی ہوئی چوہدرائی کے پاس گئی اور غصے سے بولی

"لوگ خواہ مخواہ باتیں بنا رہے ہیں۔ رابو کو بدنام کررہے ہیں۔ میرا بیٹا دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزت کرنا جانتا ہے۔"

چوہدری نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں مائی خیراں کہ ساجے بہت نیک لڑکا ہے۔ لیکن ہم لوگوں کی زبانیں کیسے بند کریں۔ سیلاب کے بعد ساجے یہاں سے چلا جائے گا۔ مگر میری بیٹی یہاں کسی سے

آنکھ ملا کر بات نہیں کرسکے گی۔"

چوہدرائی نے کہا۔

"مائی خیراں۔ میں اپنی بیٹی کو اور تم اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ دونوں میں کوئی کھوٹ نہیں ہے مگر ہمیں اس دنیا میں عزت آبرو سے رہنے کیلئے جھوٹ کے آگے بھی سر جھکا دینا پڑتا ہے۔ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ جھوٹ ہے لیکن یہ جھوٹ سچ سے بھی زیادہ سچ بن گیا ہے۔۔۔" چوہدری نے کہا۔

"دانشمندی یہی ہے کہ ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے یہ بدنامی خود بخود ختم ہوجائے۔"

مائی خیراں نے انہیں ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"اور وہ دانشمندی کا طریقہ کیا ہے۔؟"

چوہدری جھجکتے ہوئے بولا۔

"یہی کہ دونوں کی شادی کردی جائے۔"

مائی خیراں بڑے ٹھوس لہجے میں بولی۔

"ساجے کی شادی اب صرف شادو سے ہوگی۔"

چوہدرائی نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

"ہماری بیٹی کسی سے کم نہیں ہے۔ اس کیلئے ساجے سے اچھے رشتے آسکتے تھے لیکن یہ بدنامی اب اس کی بدنصیبی بن جائے گی۔ یاد رکھو مائی خیراں میری بیٹی کو بدنام کرکے تم شادو کو بہو نہیں بنا سکو گی۔"

چوہدری نے کہا۔

"میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ ساجے نے بھی رابو کو مہمان خانے میں رکھ کر غلطی کی ہے۔ اسے بھی اس غلطی کی تلافی کرنی ہوگی۔"

"میرے بیٹے نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ وہ رابو کو یہاں لیکر آتا تو جناب علی کے آدمی تمہاری طرح تمہاری بیٹی کو بھی حویلی میں بند کر دیتے۔ کیا اس وقت تم اپنی بیٹی کی عزت بچا سکتے تھے۔؟"

چوہدری لاجواب ہو کر چوہدرانی کو دیکھنے لگا۔ مائی خیراں بولی۔

"ساجے احمق نہیں ہے اس نے جہاں پہلوان کی بیوی بچوں کو ساتھ رکھا تھا کہ اس پر کوئی غلط الزام نہ لگے۔ تم لوگ ایک بیٹی کے ماں باپ ہو۔ بہتری اسی میں ہے کہ اپنی بیٹی کے متعلق سوچ سمجھ کر باتیں کرو۔ ورنہ میرے بیٹے پر الزام لگتا رہا تو پھر میں بھی یہ سوال اٹھاؤں گی کہ رابو اغوا کی رات کالے خاں کے ساتھ تھی۔ ساجے تو دوسری صبح اسے بچا نے گیا پھر ساجے کے ساتھ کیوں؟ اسے کالے خاں کے ساتھ کیوں نہیں بدنام کیا جاتا؟"

چوہدری کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

چوہدرانی غصہ سے بولی۔

"تم میری بیٹی کو ایک معمولی ملازم کے ساتھ بدنام کر رہی ہو؟"

"اور نہیں تو کیا۔ کیا میرا بیٹا ہی بدنام ہونے کے لئے رہ گیا ہے؟"

چوہدری نے بوکھلا کر چوہدرانی سے کہا۔

"رابو کی ماں۔ بس اس بحث کو یہیں ختم کرو۔ ابھی یہ بات صرف مائی خیراں کی زبان سے نکلی ہے۔ اگر یہ بات پنڈ والوں کے دماغ میں آ گئی اور رابو کے ساتھ کالے خاں کا نام آ گیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہینگے۔"

چوہدرانی بے بسی سے پہلو بدل کر مائی خیراں کو گھورنے لگی۔

مائی خیراں نے کہا۔

"تم پیسے والے لوگ توڑ جوڑ سے باز نہیں آتے ہو۔ ایک غریب کا احسان بھول جاتے ہو۔ کہ اس نے کس طرح دشمنوں کا مقابلہ کر کے تمہاری بیٹی کی عزت بچائی تھی۔ ذرا عقل سے کام لو چوہدری۔ بیٹی کو بدنامی سے بچانا چاہتے ہو تو لوگوں کو یہاں بلاؤ۔ ان کے سامنے ساجے اور رابو کلام پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائیں گے کہ ان کے درمیان بھائی اور بہن کا ایک مقدس رشتہ ہے۔ بدنامی سے بچنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔"

دونوں سر جھکا کر خاموشی سے سوچنے لگے۔

رابو کمرے کے باہر کھڑی ہوئی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اب اسے اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ وہ مائی خیراں کے تیور کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ کہ اس نے ساجے سے جبراً شادی کرنے کی کوشش کی تو اس کی ماں اسے کالے خاں کے ساتھ بدنام کر دے گی۔ اور وہ ایسی بدنامی اور ذلت کا سامنا نہیں

کرنا چاہتی تھی۔

وہ سر جھکا کر شکست خوردہ انداز میں چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔

ساجے دل برداشتہ ہو کر حویلی میں آیا۔ تاکہ ریشماں کے کمرے میں بیٹھ کر اپنی نیکیوں پر پچھتا سکے۔ زینے پر شادو کھڑی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی ساجے اس کے قریب آ کر ایک لمحہ کے لئے رکا اور اپنی محبوبہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر جانے لگا۔

وہ لرزتے ہوئے لہجے میں ہولے سے بولی۔

"ساجے ــ!"

اس کے قدم رک گئے۔ اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"شادو ــ مجھے دنیا والوں کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں ــ مجھے تو اس بات کا دکھ ہے کہ شاید تم بھی مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ ریشماں کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آ گیا تھا کہ اب میں بھی تمہیں اپنی ایمانداری کا یقین نہیں دلا سکتا ...."

"ایسی بات نہ کہو ساجے ــ مجھے تم پر اعتماد ہے، پورا اعتماد ہے ــ مجھے صرف اپنی بدنصیبی پر رونا آتا ہے کہ تم میرے قریب آتے آتے دور ہو جاتے ہو"

ساجد پلٹ کر اس کے قریب آ گیا اور اس کی ٹھوڑی کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

"دشمنوں سے لڑنے والی بہادر لڑکی روتی ہوئی اچھی نہیں لگتی۔"

وہ اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"شادو ــ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے سیلاب ختم ہونے دو۔ میں تمہیں اور ماں جی کو لے کر یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے شادو کو سینے سے لگا لیا۔

کتنے طوفانوں سے گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔

پھر رات کی خاموشی میں پانی کی چھپا چھپ سنائی دی کوئی آ رہا تھا۔

"کون ہے ــ؟" ساجے نے پوچھا۔

"حمیدے ــ!"

حمیدے چلتا ہوا روشنی میں آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی ساجد اس کے چہرے کو غور سے پڑھنے لگا۔

حمیدے نے بڑے کرب سے کہا۔

"میری بہن بدنام ہو رہی ہے۔"

ساجد نے جواب دیا۔

"وہ میری بھی بہن ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" حمیدے نے کہا۔ "تم سچے اور کھرے آدمی ہو۔ میں تمہاری بدنامی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے رائفل لیکر گھوم رہا ہوں۔ اب اگر کسی نے تمہارے اور رابو کے متعلق ایک لفظ بھی کہا تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔"

"نہیں حمیدے — ایسی غلطی نہ کرو۔"

"یہ غلطی مجھے کرنی ہی پڑے گی۔ میں تمہاری طرف سے لڑتا رہوں گا۔ اور تمہاری سچائی کا یقین دلاتا رہوں گا۔ ساجے تم نے رابو پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اس کے بدلے تمہیں شادو نہ ملی تو لوگوں کا نیکی پر سے ایمان اٹھ جائے گا۔"

ساجد نے کہا۔

"میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ لیکن لوگوں کو سمجھانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ لاؤ رائفل مجھے دو۔۔۔"

اس نے حمیدے سے رائفل چھین لی اور کہا۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔ دیکھو اس قدر بدنام ہونے کے بعد بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ تم بھی ذرا ہمت سے کام لو۔ ہم رفتہ رفتہ لوگوں کو اپنی سچائی کا یقین دلا دیں گے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے حویلی سے باہر آئے۔ شادو بھی انکے ساتھ تھی۔

ساجد نے کہا۔

"حمیدے اگر تم نے خون خرابہ کیا اور جیل چلے گئے تو پھر تمہارے گھر میں جوان بہن کی حفاظت کرنے والا کون رہیگا۔ ناصرہ دلہن کیسے بنے گی؟"

گلی کے دوسری طرف کرم دین کی چھت پر ناصرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ حمیدے سر جھکا کر سوچ رہا تھا۔ اسلئے تاروں کی چھاؤں میں اسے دیکھ نہ سکا۔

ناصرہ نے شادو کو مخاطب کیا۔

"نی شادو — اکیلے دل نہیں لگتا۔ میرے پاس آجا۔۔۔"

ساجد نے مسکرا کر ہولے سے کہا۔

"حمیدے — یہ لڑکیاں اپنے دل کی بات کہنا خوب جانتی ہیں۔ سنا تم نے؟ ناصرہ کا اکیلے دل نہیں لگ رہا ہے۔"

حمیدے مسکرا کر چور نظروں سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ شادو نے چھیڑا۔

"اس طرح چوری سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔"

ساجد قہقہے لگانے لگا۔

رابو اپنی کھڑکی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے سائے کی طرح نظر آرہے تھے اس نے درمیان میں کھڑے ساجد کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر کھڑکی سے نکال کر بولی

"ناصرہ بھابھی — شادو ہم دونوں کی بھابھی ہے اسے لیکر یہاں چلی آؤ آج میں بھائیجان کو گھر میں نہیں آنے دوں گی۔"

ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھو حمیدے — رابو سچے رشتے اور سچی محبت کا اظہار کر رہی ہے۔ ہمارے دل صاف ہیں تو باہر کی کوئی بات ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ساجے۔ نیکی اور بدی کی جنگ ہمیشہ ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ہمیں ہمت نہیں ہارنا چاہیئے۔"

ناصرہ چھت سے اتر کر گلی کے دوسری طرف آگئی تھی۔ شادو سیلاب کی لہروں کو کاٹتی ہوئی ناصرہ کے پاس گئی۔ پھر دونوں لڑکیوں نے گھوم کر میٹھی نظروں سے اپنے اپنے محبوب کو دیکھا اور رابو کی طرف جانے لگیں۔

ان کے خیالات میں شادیانے بج رہے تھے۔

پھر رات کے سناٹے میں ہوائیں سسکیاں لینے لگیں۔ دور سے یوں لگ رہا تھا جیسے شہنائی رو رہی ہو۔ کسی کا جہیز ڈوب رہا ہے۔ کسی کی بارات لٹ رہی ہے۔ حمیدے نے گھبرا کر کہا۔

"کسی کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ کون ہے؟"

ساجد نے ایک سرد آہ بھر کر ہولے سے کہا۔

"نازو۔!"

ختم شد